دینی مدارس

روایت اور تجدید

علماء کی نظر میں

مولانا گلزار احمد مظاہری   مفتی محمد حسین نعیمی

جاوید احمد غامدی   مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی   مولانا سیّد ابوبکر غزنوی   ملک غلام علی

مولانا عبدالرحیم صاحب   مولانا عبدالحق   مولانا مفتی محمد یوسف صاحب

مولانا محمد ایوب جان بنوری   مولانا محمد ناظم ندوی   مولانا احمد سعید

مولانا چودھری نذیر احمد   مولانا خان محمد   مولانا علی محمد مظاہری   مولانا احمد علی   مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

ممتاز احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

یہ وہ مطالعہ ہے جو اس وقت کیا گیا جب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ایک دن یہ ایک حساس مسئلہ بننے والا ہے جو پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالے گا۔ اس وقت نہ طالبان تھے نہ دہشت گردی کے حوالے سے ان مدارس کا کردار۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ قدرت نے اس کام کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو اس مطالعہ کے لئے موزوں ترین تھا۔ ممتاز احمد نہ صرف ہمارے چوٹی کے ماہر عمرانیات و سیاسیات ہیں، بلکہ ادب، تہذیب، فلسفہ، مذہب اور دیگر متعلقہ علوم میں ان کی گہری دلچسپی نے ان کی شخصیت میں ایسا رچاؤ اور ایک ایسی سوجھ بوجھ پیدا کردی ہے جو کم ہی میسر آتی ہے اور جو اس کام کے لیے نہایت ضروری تھی۔ اس سے اس مطالعہ میں متنوع جہتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ افراد کا انتخاب بھی ان کے ذہنی پھیلاؤ اور معاملہ فہمی کو ظاہر کرتا ہے۔ خیر ممتاز احمد ان حوالوں سے اب تک بہت کام کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اچھا کیا کہ انہوں نے اسے کتابی شکل میں چھاپنے کا فیصلہ کیا۔ یہ علمی دُنیا اور ہم جیسے عامیوں کے لئے بہت مفید ہوگا۔

سجاد میر

دانشور، صحافی، ٹی وی اینکر

''دینی تعلیم کے ادارے، معاشرے کی تعمیر و تہذیب میں جو کردار ادا کر رہے ہیں، اسے منصفانہ تنقیدی مطالعے کا موضوع بنانا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ پروفیسر ممتاز احمد اس اعتبار سے دینی تعلیمی روایت کے موجودہ چلن کو پرکھنے والوں میں ممتاز ترین مقام رکھتے ہیں کہ، انھوں نے بیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں، اُس وقت 'دینی تعلیم' کو اپنے گہرے مطالعے اور تحقیق کا موضوع بنایا، جب اُن کی اس 'فرہادیت' پر احباب حیرت کا اظہار کرتے تھے۔ تب انھوں نے تمام دینی مسالک کے اکابر اساتذہ، جید علماء اور اصحابِ نظر ماہرینِ تعلیم سے، کشادہ روی سے مکالمات کیے۔ ساتھ ہی اہل مغرب کو سمجھایا کہ علمی اور اخلاقی روایت کے سفر میں ان دینی مدارس کا کیا مقام ہے۔ ان مکالمات کے بیش تر حُدی خواں اپنا نغمۂ جاں فزا سنا کر خلد آشیانی بن چکے ہیں۔ جبکہ ہمدرد اور روشن دماغ جناب محرّک ان مکالماتی امانتوں کو ہمارے سپرد کر رہے ہیں۔ اس تناظر میں یہ کتاب ہمارے ماضی کو ہمارے حال اور مستقبل سے اس شائستگی سے ہم آغوش کرتی ہے کہ سخت گرہیں کھلتی ہیں اور دینی تعلیمی روایت کے در خوشی خوشی وا ہوتے ہیں۔''

پروفیسر سلیم منصور خالد

دانشور، محقق، مصنف
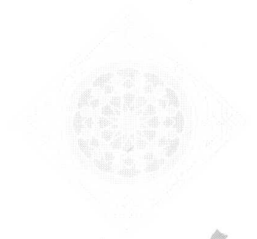
دینی مدارس
روایت اور تجدید
علماء کی نظر میں
www.KitaboSunnat.com

دینی مدارس

روایت اور تجدید

علماء کی نظر میں

ممتاز احمد

دینی مدارس روایت اور تجدید

اہتمام: اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ

تاریخ اشاعت: 2012ء

تعداد: 1000

ناشر: www.emel.com.pk

تقسیم کنندہ: آفس نمبر 12، سیکنڈ فلور، مجاہد پلازہ، بلیو ایریا
اسلام آباد۔ فون: 051-2803096

ISBN : 978-969-9556-04-3

ڈیزائن / پرنٹنگ: www.industree.com.pk

قیمت: 590 روپے US$ 12

انتساب

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مرحوم دارالعلوم حقانیہ (اکوڑہ خٹک)

اور

مفتی محمد حسین نعیمی مرحوم (جامعہ نعیمیہ، لاہور)

کے نام جو علم، حلم، تقویٰ، رواداری

اور اسلامی اخلاق کی بہترین مثال تھے

حرف ناشر

ایمل مطبوعات نے چند برس قبل جب اشاعت کے میدان میں قدم رکھا تو اپنی پیشکش کے معیار، ندرت اور جدت کی بنیاد پر صاحبانِ ذوق کی حوصلہ افزائی اور داد و دہش کے باوجود نووارد ہونے کا احساس ایک طرح کی کسر نفسی کا باعث رہتا تھا۔ اس پس منظر میں زیر نظر کتاب کی اشاعت کا اعزاز یقیناً ہماری خود اعتمادی میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

یہ کتاب، گذشتہ چار دہائیوں کے عہد پر محیط، نامور علما کی آراء پر مشتمل اپنے متنوع اور خیال انگیز مواد کی بنیاد پر معنوی اعتبار سے آمدہ کئی دہائیوں سے بھی متعلق ہے۔ موجودہ حالات میں دینی مدارس سے متعلق مباحث اور داخلی و خارجی اضطراب کے حوالے سے ان مصاحبوں کی اہمیت محض تاریخی ہی نہیں بلکہ مستقبل کی ممکنہ صورت گری کی بنیاد بھی بن سکتی ہے۔ آج کے حالات نے دراصل ان مصاحبوں کو زمانی بعد کے باوجود ہمارے حال سے متعلق و منسلک کر کے انہیں ایک عصری جہت عطا کر دی ہے۔ یوں یہ شخصی خیالات ہی نہیں بلکہ اس موضوع کی — بیک وقت — بوقلمونی اور یک رنگی کا پرتو بھی ہے۔

باکمال ذوق کے حامل ڈاکٹر ممتاز صاحب نے کہ جن کے بے پایاں التفات اور اس پہ مستزاد میرے ممدوح سلیم احمد مرحوم سے انکے قرب نے میرے دل میں ہمیشہ دھوپ چھاؤں کیے رکھی، دھوپ استحقاق کی اور چھاؤں انفعال کی ۔۔۔۔ اپنے فکری پس منظر اور جدید ذہنی تربیت کے ساتھ اس موضوع کا حق اس عمدگی سے ادا کیا کہ تمام متعلقہ حلقوں نے انکی علمی ذمہ داری اور دیانت داری کی تحسین کی اور شاید اسی رویہ کی ہمارے معاشرے میں آج ہمیشہ سے بڑھ کر ضرورت ہے۔ اپنی روایت سے تعلق، جدید اسلوب تحقیق و نظریہ علم کی شناوری نے جس طرح ممتاز صاحب کو معاصر اہل علم سے ممتاز کیا ہے یہ کتاب اسکی پوری طرح مظہر ہے۔

شاہد اعوان

ایمل مطبوعات، اسلام آباد

مقدمہ

۱۹۷۵ء میں جب میں نے مدارس کے علماء کرام کے انٹرویو لینا شروع کیے تو مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ اب سے پچیس برس بعد بین الاقوامی سطح پر پاکستان اور اسلام کی پہچان مدارس، علماء اور دہشت گردی سے متعین ہوگی۔ لفظ مدرسہ انتہا پسندی، فرقہ واریت اور تشدد کا ہم معنی بن جائے گا اور امریکی سیکرٹری دفاع رمز فیلڈ، سیکرٹری آف اسٹیٹ ہلری کلنٹن، نائب صدر جو بائیڈن اور برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر مدارس پر اور ''مدراسا ریفارمز'' پر ایسے بات کریں گے جیسے اُن کی ساری زندگی مدارس کے نظام تعلیم کا مطالعہ اور تجزیہ کرتے ہی گزری ہے۔ جو بائیڈن نے تو ایک بار سینیٹ میں مدارس عربیہ پر اس اعتماد کے ساتھ گفتگو کی جیسے اُنہیں ''میزان الصرف''، ''قدوری''، ''نحو میر'' اور ''ہدایہ'' از بر ہوں اور سینیٹ میں آنے سے پہلے مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک میں زیر تعلیم رہے ہوں۔

خود اپنے ملک میں، ۱۹۹۰ء کی دہائی میں اور خصوصاً ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے خودکش حملوں کے بعد، ہمارے انگریزی میں لکھنے والے صحافیوں، کالم نگاروں اور دانشوروں نے ...... اور ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے ساری زندگی کسی مدرسے کے احاطے میں قدم تک نہ رکھا تھا...... مدارس عربیہ کے بارے میں، مدارس کے علما اور طلباء کے بارے میں، اپنے اور بیرون ملک قارئین کے لیے ایسی ایسی مبالغہ آمیز اور بعض اوقات مضحکہ خیز تحریریں لکھیں جو صرف ایک غیر ذمہ دارانہ صحافتی اور علمی ماحول ہی میں لکھی جا سکتی ہیں۔ ہمارے صحافتی شعبے میں چونکہ verification اور fact checking کی کوئی واضح روایت نہیں ہے اس لیے صحافی حضرات اور کالم نگار جو کچھ بھی لکھ دیتے ہیں، اخباروں کے مدیر حضرات من وعن شائع کر دیتے ہیں اور صورت حال کی وضاحت اور تصحیح کے بعد بھی رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

مجھے یاد ہے کہ ۹/۱۱ کے چند سال بعد امریکہ کے ایک نہایت مؤقر اور ذمہ دار اخبار Christian

Christian Science Monitor نے اپنے صفحۂ اوّل پر اسلام آباد میں اپنے ایک پاکستانی نمائندے کی سٹوری شائع کی جس میں پاکستانی نامہ نگار نے لکھا کہ صدر مشرف کے اس وعدے کے باوجود کہ وہ مدارس کی توسیع اور اضافہ پر پابندیاں لگا رہے ہیں، پاکستان میں مدارس کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اپنے اس دعوئ کے ثبوت میں نامہ نگار نے لکھا کہ مثلاً گوجر خان میں مدارس کی تعداد پچاس سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مذکورہ نامہ نگار نے یہ بھی لکھا کہ انہوں نے گوجر خان کے ایک مدرسہ میں ایک نوعمر طالب علم سے، جو ابتدائی مرحلہ تعلیم میں تھا، پوچھا کہ وہ مدرسے میں کیوں پڑھ رہا ہے اور وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کیا کرنا چاہتا ہے۔ نوعمر دیہاتی طالب علم کو خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے امریکی قارئین اور سیکرٹری رمزفیلڈ کس طرح کا جواب سننا پسند کریں گے۔ چنانچہ اس نے نہایت obliging انداز میں سینہ پُھلا کر کہا: ''میں امریکہ کے خلاف جہاد میں شامل ہو کر شہادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

میرا تعلق چونکہ گوجر خان سے ہے اور میں اپنے شہر کے مدارس سے رابطے میں بھی رہتا ہوں، اس لیے مجھے تعجب ہوا کہ یہ پچاس مدارس کس تورا بورا میں چھپے ہوئے تھے۔ میں نے خبر پڑھتے ہی Christian Science Monitor کے مدیر کو خط لکھا اور اُن کے پاکستانی نامہ نگار کی گوجر خان کے مدارس کی گنتی پر شبہات کا اظہار کیا۔ خوشگوار حیرت کی بات یہ تھی کہ پاکستانی مدیران اخبارات کے برعکس CSM کے ایڈیٹر نے صرف ایک دن کے وقفے سے مجھے ای میل میں لکھا کہ انہوں نے اسلام آباد میں ایک معقول رقم کے عوض ایک independent صحافی کو مامور کیا ہے کہ وہ ہمارے نامہ نگار کے ساتھ گوجر خان جا کر اُن کی گنتی کی تصدیق کریں اور یہ کہ اُن کی تحقیق مکمل ہونے پر مجھے مطلع کر دیا جائے گا۔ ایک ہفتے بعد مجھے جو جواب وصول ہوا وہ یہ تھا کہ CSM کے نامہ نگار نے ایک تو گوجر خان شہر کی بجائے پوری تحصیل کے مدارس کو اپنی رپورٹ میں شامل کیا تھا اور دوسرے انہوں نے مساجد میں بچوں کو صبح کے اوقات میں ناظرہ قرآن پڑھانے کی سہولت کو بھی مدرسوں میں شمار کر کے پچاس کی گنتی بنا دی تھی۔ چند ہفتوں بعد جب میں پاکستان آیا تو میں خود اس مدرسے میں گیا جس کے نوعمر طالب علم نے CSM کے نامہ نگار کے بقول امریکہ کے خلاف جہاد کرتے

ہوئے شہادت کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مہتمم صاحب نے بتایا کہ نامہ نگار مذکور نے اُن کی موجودگی میں ایک طالب علم سے گفتگو کی تھی، طالبِ علم سے اُس کا نام پوچھا تھا، اُس کے گاؤں کا نام پوچھا تھا اور اِدھر اُدھر کی کچھ مزید باتوں کے بعد طالب علم سے پوچھا کہ وہ بڑا ہو کر کیا کرنا چاہتا ہے۔ طالب علم نے شرما کر کہا ''مجھے نہیں معلوم'' نامہ نگار نے سوال دُہرایا تو طالب علم نے پھر بھی یہی کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔ اس پر نامہ نگار نے طالب علم کو prompt دیتے ہوئے کہا ''کیا تم امریکہ کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید بننا چاہتے ہو؟'' اس پر طالب علم نے ''ہاں'' میں بس سر ہلا دیا۔ نامہ نگار نے یہ جملہ طالب علم سے منسوب کر کے ذمہ دار صحافت کا گویا حق ادا کر دیا۔ تو یہ تھا سارا قصہ مدارس کے طلبہ کے جذبۂ شہادت کا امریکہ کے خلاف۔

لیکن آیئے چلتے ہیں ۱۹۷۵ء کی طرف جب میں نے یہ انٹرویوز کیے۔ ۱۹۷۳ء کا دستور پیپلز پارٹی کی حکومت اور حزبِ اختلاف کی تمام جماعتوں کی باہمی مشاورت اور تعاون سے منظور ہو چکا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں علماء اور مدارس کے طلبہ کی ملک گیر تحریک کے نتیجے میں جماعتِ احمدیہ کو دستوری ترمیم کے ذریعہ خارج از اسلام قرار دیا جا چکا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید کی حکومت ابتدائی اُتار چڑھاؤ کے بعد سیاسی اور اقتصادی استحکام کی نسبتاً بہتر سطح پر آ چکی تھی۔ سابق صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کی مشترکہ حکومتوں کی معزولی کے بعد حزبِ اختلاف کی بڑی جماعتوں اور خصوصاً مفتی محمود مرحوم کی جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے ایک نئی سیاسی تحریک کے لیے کوششوں کا آغاز تو ہو چکا تھا لیکن مذہبی سیاست کو ابھی تک مرکزی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم کی سرگرم قیادت میں جمعیت علمائے پاکستان ملکی سیاست میں ایک اہم کردار کے طور پر نمایاں تھی جبکہ جماعتِ اسلامی اپنی تنظیمی مضبوطی اور کارکنوں کی غیر متزلزل اطاعت کے باوجود میاں طفیل محمد مرحوم کی دھیمی امارت میں ''بنگلہ دیش نامنظور'' اور ''ختمِ نبوت'' کی تحریکوں کے بعد کسی نئی سیاسی تحریک کے انتظار میں خاموش تھی۔

۱۹۷۵ء کے وسط میں وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی مرحوم کے ایک آدھ بیان سے علماء کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ شاید حکومت مدارس کو یا تو اپنی تحویل میں لینا چاہتی ہے یا مدارس کے نظم و نصاب میں مداخلت کے بارے میں سوچ رہی

ہے۔علماء کا ردِ عمل اس پر فوری اور شدید تھا۔جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی،علمائے دیوبند اس ضمن میں سب سے آگے تھے۔بریلوی،اہلِ حدیث اور جماعتِ اسلامی کے حلیف مدارس کی جانب سے بھی ردِ عمل کم پُرجوش نہیں تھا۔البتہ بریلوی اور جماعت اسلامی کے علماء اصولی طور پر مدارسِ عربیہ کے نظم ونسق اور نصاب میں ''اسلامی حکومت'' کے رول کو نہ صرف غلط نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے اسلامی حکومت کی اہم ترین ذمہ داری بھی سمجھتے تھے۔ذوالفقار علی بھٹو شہید کی حکومت ختم ہونے کے چند سال بعد کوثر نیازی مرحوم سے اسلام آباد میں ایک ملاقات کے دوران، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا اس وقت کی حکومت واقعی دینی مدارس کو سرکاری تحویل میں لینے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔مولانا کوثر نیازی نے بتایا کہ اُنہوں نے بھٹو صاحب کے سامنے یہ بات رکھی تھی کہ دینی مدارس میں ایک خاصی بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنے موجودہ نصاب میں تبدیلی اور اصلاح کی خواہاں ہے لیکن ان مدارس کے پاس جدید علوم کو نصاب تعلیم میں شامل کرنے کے لیے وسائل نہیں ہیں۔اس کے ساتھ ہی میں نے بھٹو صاحب سے یہ بات بھی کہی تھی کہ اگر زکوٰۃ کو سرکاری سطح پر جمع کرنے کا کوئی انتظام بنایا جاسکے تو حکومت اس فنڈ سے،علماء کے تعاون اور اشتراک کے ساتھ،سوشل ویلفیئر (Social Welfare) کے چند بڑے پراجیکٹ بنا کر غریب اور نادار لوگوں کے لیے روزگار کے مستقل مواقع پیدا کرسکتی ہے۔بھٹو صاحب نے ان تجاویز کو پسند کیا اور کہا کہ اگر آپ ان دونوں کاموں کے لیے علماء کا تعاون حاصل کرسکیں تو میں پیش قدمی کے لیے تیار ہوں۔بھٹو صاحب نے یہ بھی کہا کہ جو مدارس اصلاحِ نصاب کی سکیم میں رضا کارانہ طور پر شامل ہونا چاہیں،حکومت ان کو وسائل مہیا کرنے کے لیے تیار ہے۔

۱۹۷۵ء کے وسط میں جب میں نے علماء مدارس کے انٹرویوز لینا شروع کیے تو اکثر علماء کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب کی حکومت کی نیت مدارس کے بارے میں ٹھیک نہیں ہے۔ایک دن اچانک وار کیا جائے گا اور سکولوں،کالجوں اور فیکٹریوں کی طرح مدارس بھی قومی تحویل میں ہوں گے۔یہ تھا وہ پس منظر جس میں میں نے علماء کرام سے مدارس کے انتظام وانصرام میں سرکاری مداخلت کے بارے میں متعدد سوالات کیے۔تاہم میرے اکثر سوالات کا محور مدارس دینیہ کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم پر ہی رہا۔میرا مقصد یہ تھا کہ میں علماء کے خود اپنے نقطۂ نظر سے ان مقاصد کو سمجھنے کی کوشش کروں جن کے حصول کے لیے یہ مدارس قائم کیے گئے ہیں اور یہ نصاب مرتب کیا گیا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ اکثر علماء کرام مقاصد تعلیم کے بارے میں تو بالکل واضح تھے، تاہم اس بارے میں اُنہیں شبہات ضرور تھے کہ کیا مروجہ نصاب تعلیم ان مقاصد کی تکمیل میں معاون ہے یا نہیں۔ علماء نے نصاب اور نصابی کتب نیز طریق تدریس کے بارے میں بالعموم بے اطمینانی کا اظہار تو کیا لیکن اس بات کی وضاحت کم ہی کی کہ اصلاح احوال کے لیے کون سے اقدامات ضروری ہیں؟ چند عمومی اشارات کے علاوہ ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی واضح لائحۂ عمل نہیں تھا۔ اکثر نے نصابِ تعلیم میں ترمیم، اضافے اور اصلاح کی ضرورت کو تو تسلیم کیا لیکن وسائل کی کمی کے پیش نظر پیش قدمی سے معذرت کی۔ بعض علماء کا خیال تھا کہ وہ اکیلے یہ کام نہیں کر سکتے اور یہ کہ جب تک تمام مدارس مل کر کسی اصلاح شدہ نصاب پر متفق نہ ہوں، اصلاح کی کوشش بارآور نہیں ہو سکتی۔ کچھ کا خیال تھا کہ جدید علوم کو شامل کرنے سے طلبہ کی نظر میں اصل یعنی ''دینی علوم'' کی اہمیت کم ہو جائے گی اور وہ دنیاوی فوائد کے حصول کے لیے اپنی زیادہ تر توجہ جدید علوم کو دینا شروع کر دیں گے۔ بعض علما نے ایسے مدارس کی مثال دی جہاں قدیم اور جدید علوم کو اکٹھا کرنے کے تجربات کیے گئے تھے۔ لیکن ان تجربات کا، اُن کے نزدیک، کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا اور ان مدارس کے فارغ التحصیل دونوں قسم کے علوم میں کچے رہ گئے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ آخر مدارس کے طلبہ کو جدید علوم پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟..... اگر اُنہیں ''دین کا کام'' ہی کرنا ہے تو ان کے لیے دینی علوم ہی کافی کیوں نہیں ہیں؟ بعض علماء نے تو کھل کر یہ بھی کہہ دیا کہ صاحب اگر ہم اپنے نصاب میں انگریزی، حساب، کیمسٹری اور فزکس شامل کر دیں تو پھر ہمیں مدارس کے لیے چندہ کون دے گا؟ ہمیں تو عامۃ المسلمین چندہ اس لیے دیتے ہیں کہ ہم بچوں کو قرآن اور حدیث اور فقہ پڑھاتے ہیں۔ فزکس، کیمسٹری اور انگریزی پڑھانے کے لیے لوگ کیا ہمیں زکوٰۃ اور صدقات اور خیرات کے پیسے دیں گے؟

میرے لیے حیرت انگیز بات یہ بھی تھی کہ اکثر علما ذرا کریدنے پر مدارس دینیہ کی موجودہ صورت حال (یعنی ۱۹۷۵ء کی صورت حال) سے غیر مطمئن نظر آئے۔ ان کے عدم اطمینان کی بنیاد معیار تعلیم کا انحطاط اور اساتذہ کی عدم دلچسپی تھی۔ لیکن اساتذہ سے زیادہ علما کی شکایت بالعموم طلبہ سے تھی کہ ان میں دینی تعلیم کے لیے وہ شغف نہیں ہے جو مثلاً خود ان کے اپنے دور طالب علمی میں تھا۔ مولانا حامد علی صاحب (خیر المعاد، ملتان) کو

شکایت تھی کہ ''طلبہ میں ذوق وشوق کی کمی ہے۔'' مولانا علی محمد مظاہری صاحب (میانوالی) کا خیال تھا کہ ''میرے زمانہ طالب علمی میں طلبہ اور اساتذہ کے درمیان ادب واحترام کی فضا پائی جاتی تھی۔ موجودہ دور میں یہ خرابی پیدا ہوگئی ہے کہ طلبہ بے باک ہوگئے ہیں، ان کے اندر اپنے اساتذہ کا وہ احترام باقی نہیں رہا جو پہلے زمانہ میں ہم نے دیکھا ہے۔''

مجھے تعجب ہوا کہ میرے ۱۹۷۵ء کے انٹرویوز سے دو نسل پیچھے سہارنپور کے مولانا محمد زکریا مرحوم کو بھی یہی شکایت تھی کہ مدارس کے طلبہ میں اساتذہ کا احترام باقی نہیں رہا جو خود ان کے دورِ طالب علمی میں تھا۔ مولانا زکریا اس بات پر بھی دُکھی تھے کہ طلباء ٹیوشن پڑھانے کے چکر میں خود اپنی تعلیم سے دلچسپی نہیں لے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج (یعنی ۲۰۱۲ء) میں مدارس کے منتظمین سے طلبہ کی دلچسپی معیارِ علم اور اساتذہ کے احترام کے بارے میں سوال کروں تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں؛ یعنی ان کے اپنے دورِ طالب علمی میں، طلبہ میں تعلیم کا ذوق وشوق تھا، اساتذہ کا ادب واحترام تھا اور معیارِ تعلیم بھی بلند تھا۔ دلاور فگار نے غلط نہیں کہا تھا کہ ''حالاتِ حاضرہ کو کئی سال ہوگئے۔''

البتہ ایک بات ایسی ہے جس کی واضح گواہی میں دے سکتا ہوں۔ ۱۹۷۵ء میں میں نے علماء کرام سے انٹرویوز لینے کا آغاز کیا اور اس سلسلے میں کراچی، لاہور، سرگودھا، ملتان، پشاور اور میانوالی کے مختلف مدارس میں حاضری دی۔ اپنے زمانے کے معتبر اور جید علماء کرام سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان علما کا تعلق مختلف مسالک سے تھا۔ ان میں دیوبندی بھی تھے، بریلوی بھی تھے، اہل حدیث بھی تھے، جماعت اسلامی سے وابستہ علماء بھی تھے اور مولانا ناظم ندوی مرحوم بھی تھے جن کا تعلق ندوہ کی روایت سے تھا۔ لیکن ایک چیز جو ان سب میں مشترک تھی وہ ان سب حضرات کا انکسار، تواضع اور حلم تھا۔ یہ سبھی لوگ علم اور تقویٰ میں، اپنے دور میں ممتاز ترین مقام پر فائز تھے۔ نہ صرف اپنے اپنے فرقے اور مسلک میں، بلکہ بلالحاظ مسلک، پورے ملک کے علمی اور دینی حلقوں میں ان کا احترام تھا۔ اس سب کچھ کے باوجود، ان حضرات میں نہ تو اپنے علم کا غرور تھا، نہ اپنے زُہد وتقویٰ کا گھمنڈ۔ ان کی گفتگو میں متانت تھی اور لہجے میں اعتدال وتوازن...... میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ ان

علما ، میں سے کسی ایک نے بھی ، گفتگو کے نازک ترین لمحات میں بھی ، اپنے ہم عصروں یا اپنے مخالف مسلک کے علما کے بارے میں اہانت یا غیبت کا ایک لفظ تک نہیں کہا۔ اپنی رائے کے اظہار میں یہ سبھی حضرات یک سُو تھے ، اور پورے اخلاص کے ساتھ یک سُو تھے لیکن ان کی گفتگو میں نہ ہٹ دھرمی تھی ، نہ غرور نہ مبالغہ آمیزی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ (ماسوائے ایک نوجوان عالم کے) کسی نے اپنی رائے کو تحکم اور ادّعا کے ساتھ یا حرف آخر کے طور پر پیش نہیں کیا۔ ایک ایسا دھیما وقار (easy dignity) تھا ان کی گفتگو میں جو مجھے آج کے اکثر علما ، میں بہت کم نظر آتا ہے ، آج دھوم دھڑ کا تو بہت ہے ، مخالفوں کو للکار کر ، اپنے آپ کو حق پرست منوانے اور طلبہ کے سروں پر کفن باندھ کر اسلام کا بول بالا کرنے کا شور تو بہت ہے ، لیکن اولیاء اللہ کی صفت رکھنے والے وہ علماء کہاں جن سے ملاقات کی سعادت آج سے ۳۷ برس پہلے مجھے نصیب ہوئی تھی۔

....

اس کتاب کے آخر میں ایک انٹرویو مولانا زاہد الراشدی کا بھی شامل ہے جو ان کی چند سال قبل کی تحریروں سے ، ان کی اجازت سے ، اخذ کیا گیا ہے۔ اس انٹرویو کو شامل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' اور انتہا پسندی کے حالیہ تناظر میں مدارس کے حوالے سے جو سوالات سامنے آرہے ہیں ان پر ایک معتبر اور سنجیدگی سے غور وفکر کرنے والے عالمِ دین کے خیالات سے استفادہ کیا جائے اور علماء میں سے ایک ایسے شخص کے نقطۂ نظر کو پیش کیا جائے جو مدارس کے تعلق سے پیدا ہونے والے سوالات کے مذہبی ، سیاسی اور عالمی تناظر سے بخوبی آگاہ ہو۔ میرے نزدیک اس مقصد کے لیے جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

....

۱۹۷۵ء میں جب میں علماء کرام کے انٹرویوز لے رہا تھا تو برادرِ عزیز ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے میری بہت مدد کی اور کئی ملاقاتوں میں میرے ہم سفر بھی رہے۔ میانوالی میں عزیزم محبوب بلوچ نے مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا ، ان دونوں دوستوں کا بہت شکریہ!

سید ولی رضا نصر (Tufts University) سے بہت عرصہ قبل جب ان انٹرویوز کا ذکر ہوا تو اُنہوں نے

اصرار کیا کہ ان کی افادیت کے پیش نظر میں انہیں شائع کرنے کا جلد انتظام کروں۔ جلد تو نہیں، البتہ بدیر اُن کی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ ولی رضا نے گزشتہ ڈھائی عشروں میں اسلام' پاکستان' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی پر جو کام کیا ہے علمی حلقوں میں اُس کا ایک بڑا مقام ہے۔

اس موقع پر میں مس مہین کریم (Mahin Karim) سینئر ایسوسی ایٹ نیشنل بیورو آف ایشین ریسرچ (National Bureau of Asian Research) کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے چھ سال قبل مجھے بنگلہ دیش اور پاکستان میں مدارسِ عربیہ کی صورت حال پر تحقیق کرنے اور لکھنے پر ایک بار پھر آمادہ کیا۔

مہین کریم کی تحریک پر ہی میں نے بنگلہ دیش کے مدارس پر تین اور پاکستان کے مدارس پر دو مفصل رپورٹیں لکھیں۔ ان رپورٹوں کی بنیاد پر بعد میں مجھے تین مونوگراف شائع کرنے کا موقع ملا، جس کے لئے میں مہین کریم کی دعوت، تعاون اور تبصروں کے لئے بے حد ممنون ہوں یہ تینوں مونوگراف NBR کی طرف سے 2007,2008 اور 2009ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب کی تالیف اور تیاری میں ڈاکٹر حسن الامین، خورشید احمد ندیم، شاہد اعوان، عمر قذافی، محمد اسماعیل، ڈاکٹر طالب حسین سیال، پروفیسر سلیم منصور خالد، ڈاکٹر حسین احمد پراچہ، پروفیسر نور ور جان اور جناب حیران خٹک نے خصوصی تعاون کیا جس کے لیے میں ان سب حضرات کا بہت ممنون ہوں۔
برادران محترم پروفیسر فتح محمد ملک، پروفیسر ظفر اسحاق انصاری اور پروفیسر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن کی محبت اور توجہ میرے لیے ایک ایسا سرمایہ ہے جس کی قدر و قیمت کا اظہار میرے لیے الفاظ میں ممکن نہیں۔

ممتاز احمد

مئی ۲۰۱۲ء

اسلام آباد

مولانا
گلزار احمد مظاہری

صدر جمعیت اتحاد العلماء پاکستان

۱۷۔ اپریل ۱۹۷۰ء، لاہور

مولانا گلزار احمد کی ولادت ۱۰فروری ۱۹۲۵ء کو بھیرہ ضلع سرگودھا میں ہوئی۔ علماء کرام کی عمومی روایت کے برعکس مولانا مظاہری نے ابتدائی تعلیم سرکاری اسکول سے حاصل کی۔ آپ نے میٹرک تک تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ سے پائی۔ پھر آپ علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ یہ ایک بڑا اہم فیصلہ تھا جو آپ کے والد گرامی حاجی عبدالمجید پراچہ فیضوانہ نے کیا۔ حاجی صاحب قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت سے بہت متاثر تھے اور ابھرتی ہوئی مسلم لیگ سے وابستگی رکھتے تھے۔ مولانا مظاہری نے ایف اے تک تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی مگر اُن کے اندر کی دینی شخصیت علی گڑھ یونیورسٹی کی فضا سے مانوس نہ ہو سکی اور اُنھوں نے علی گڑھ کو خیر باد کہہ کر خالص دینی تعلیم کے اداروں میں جا کر اکتسابِ فیض کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے دینی تعلیم مدرسہ جامعہ خضریہ بھیرہ، دارالعلوم لسانیہ امرتسر اور مظاہرالعلوم سہارنپور سے حاصل کی۔ آپ نے ۱۹۴۸ء میں جماعتِ اسلامی میں شمولیت اختیار کر کے اپنی تمام خدمات جماعت اسلامی کے لیے وقف کر

دیں۔ پچاس کی دھائی کے اوائل میں آپ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ھدایت کے مطابق اپنے بیوی بچوں کے ساتھ میانوالی کی سنگلاخ سرزمین میں آکر آباد ھو گئے۔ یہاں مولانا مظاھری سنتِ ابراھیمی کے مطابق اپنے بیوی بچوں کو میانوالی "شھر" کے ریگزار میں چھوڑ کر خود دعوت و تبلیغ کے لیے کبھی پاپیادہ اور کبھی سائیکل پر کسی رفیقِ سفر کے ساتھ نکل کھڑے ھوتے تھے۔ یہاں پر مولانا کی تبلیغی سرگرمیوں سے جھاں اور بہت سے افراد متاثر ھوئے وھاں مولانا کوثر نیازی کے دل و دماغ میں مولانا مظاھری کی دعوت اور مولانا مودودی کی تحریروں نے ھلچل مچا دی اور بالآخر وہ جماعت میں شامل ھو گئے۔ مولانا مظاھری اپنی دعوتی زندگی میں پاکستان کے ھر صوبے اور ھر علاقے کے شھروں، دیھاتوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں گئے اور لاتعداد اجتماعات سے خطاب کیا۔ اللہ نے آپ کو، اردو کے علاوہ دیگر صوبائی زبانوں میں بھی روانی کے ساتھ پرجوش خطاب کرنے کا ملکہ عطا کیا تھا۔ آپ حسبِ موقع انگریزی اور عربی میں بھی خطاب کرتے۔ ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۱ء میں آپ نے امریکہ، برطانیہ، ناروے، سعودی عرب، کویت، قطر اور مشرق و مغرب کے دیگر کئی ممالک کا دورہ کیا۔ مولانا فرقہ وارانہ تعصب کو نفاذِ اسلام کے لیے زھرِ قاتل سمجھتے تھے۔ اس تعصب کے خاتمے کے لیے آپ نے جمعیت اتحاد العلماء قائم کی جس میں مولانا محمد چراغ اور مفتی سیّاح الدین کاکاخیل جیسی مستند دینی شخصیات نے شمولیت فرمائی۔ مولانا گلزار احمد مظاھری

نے دعوت و تبلیغ کے راستے میں کئی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ آپ ایک بار نہیں بار بار پسِ دیوارِ زنداں گئے اور ہر بار ۱۹۶۴ء میں آپ مولانا مودودی اور جماعت کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے دیگر ارکان کے ساتھ نو ماہ تک قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے جماعت اسلامی کے ہفتہ وار رسالے ایشیا میں ان دنوں مولانا مظاهری کے جیل کے شب و روز کی داستان "رودادِ قفس" کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔ ریڈیو پاکستان سے آپ کی تین سو سے زائد تقاریر نشر ہوئیں۔ آپ کی تقاریر کا ایک مجموعہ "خطباتِ اسلام" کے نام سے شائع ہوا۔ مولانا کو ذیابیطس کا مرض تھا۔ مولانا نے شروع شروع میں اس بیماری کو زیادہ اہمیت نہ دی اور اپنی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ تاہم ہر گزرتے دن کے ساتھ مرض بڑھتا گیا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ مولانا ۱۰ ستمبر ۱۹۸۲ء کو خالقِ حقیقی سے جاملے۔

مدارس عربیہ کا نظام تعلیم

س: دینی تعلیم کا جو نظام اس وقت مدارس عربیہ میں رائج ہے، کیا آپ اُس سے پوری طرح مطمئن ہیں؟ اگر آپ اس سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں تو اس نظامِ تعلیم میں آپ کن بنیادی کمزوریوں کی نشاندہی کریں گے؟

ج: کسی نظامِ تعلیم کی عملی شکل کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر زمانے میں نظامِ تعلیم اپنے مقصد کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی شکلیں تبدیل تو کرتا ہی رہتا ہے۔ اسی طرح ہمارے دینی نظامِ تعلیم میں کئی امور اصلاح طلب ہیں۔ اگر کسی وقت ماہرِ تعلیم اور ماہرین علوم اسلامیہ مل کر بیٹھیں اور غور و خوض کریں تو اس نظامِ تعلیم میں بعض بنیادی تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں تین طرح کی ہوں گی:

۱۔ نظامِ تعلیم میں تبدیلی

۲۔ نصابی کُتب کی تبدیلی

۳۔ طریقہ تدریس کی تبدیلی

جہاں تک دینی مدارس کی تعلیم کی خامیوں کا تعلق ہے تو خامیاں گنوانا بعض اوقات جذباتی سا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس نظام کی خرابیاں گنوانے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ گویا دین اور مذہب کی خامیاں گنوائی جا رہی ہیں۔ حالانکہ وہ دین یا مذہب کی خرابیاں نہیں ہوتیں۔ نظامِ تعلیم خواہ کوئی بھی ہو...... مثلاً یہ انگریزی نظامِ تعلیم...... اس میں تعمیر، ترقی اور تبدیلی کی گنجائش ہر وقت موجود رہتی ہے اور اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ نظامِ تعلیم کے مقصد میں کوئی عیب ہے بلکہ مدعا یہ ہوتا ہے کہ زمانے کے تغیرات کے ساتھ نظامِ تعلیم کو ہم آہنگ کیا جائے۔ مثلاً درسِ نظامی کو لیجیے جو نظام الدین طوسی کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ اب زمانہ بہت تبدیل ہو چکا ہے اور ہم پر ہرگز لازم نہیں ہے کہ ہم اسے اسی طرح سے ہی

مدارس عربیہ میں علوم اصلیہ کی طرف توجہ کم رہ گئی ہے اور علوم آلیہ پر زور زیادہ دیا جانے لگا۔

چلاتے رہیں جیسا کہ نظام الدین طوسی کے زمانے میں تھا۔

س: مسلمان معاشروں کو جدید دور میں جن مسائل سے سابقہ درپیش ہے وہ بالعموم علوم عمرانی کے مسائل ہیں مثلاً معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل۔ آپ اس سے آگاہ ہیں کہ مدارسِ عربیہ دینیہ کے نصاب میں یہ علوم نہیں پڑھائے جاتے۔ آپ کے خیال میں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ عربی مدارس کے طلبہ میں جدید دنیا کے مسائل کی تفہیم پیدا کرنے کے لیے اور یہ استعداد پیدا کرنے کے لیے کہ وہ ان مسائل کا حل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ڈھونڈھ سکیں، جدید عمرانی علوم مثلاً معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات کو شاملِ نصاب کرلیا جائے؟

ج: بالاجمال تو مدارسِ عربیہ میں تمام ہی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے مثلاً اعتقادی علوم، اخلاقی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی علوم، عمرانی اور تمدنی علوم وغیرہ کی تعلیم بالاجمال تو ہو ہی جاتی ہے۔ چونکہ ایک عرصۂ دراز سے اس نظامِ تعلیم کی سرپرستی حکومتوں کے میدان سے نکل گئی اس وجہ سے تغیر وتبدل اور نیا نصاب تعلیم اور تخصصات کا تعین اور انتظام کرنا علماء کے بس سے باہر ہوگیا۔ اس وجہ سے اس نظام کو یہی خدمت سمجھ کر ابھی تک باقی رکھا ہوا ہے کہ مدارس کے لیے مدرّس اور مساجد کے لیے خطیب اور امام مل جاتے رہیں۔ اگر کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جاسکے کہ اجمالی علم حاصل کرنے کے بعد قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، علوم سیاسیات وغیرہ میں تخصصات کی صورت پیدا ہو سکے تو اسلامی علوم کا وسیع علم ان ساری چیزوں پر حاوی ہوسکتا ہے۔

س: دینی مدارس کے نظامِ تعلیم کے بارے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ جو بنیادی اسلامی علوم ہیں وہ

جدید علوم کو پڑھانے والے ان علوم سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ وہ اعتدال قائم نہیں رکھ سکتے۔

تو پس منظر میں ڈال دیئے جاتے ہیں اور معقولات اور دیگر معاون علوم زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا یہ بات درست ہے؟

ج: عربی مدارس میں علوم کی تقسیم دو طرح سے ہوتی ہے۔۔۔ (۱) علوم اصلیہ اور (۲) علوم آلیہ۔ علوم اصلیہ میں تو قرآن، حدیث اور فقہ شمار ہوتے ہیں اور علوم آلیہ وہ ہیں جو علوم اصلیہ کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں مثلاً صرف، نحو، منطق، فلسفہ وغیرہ۔

آپ کا یہ تاثر صحیح ہے کہ مدارس عربیہ میں علوم اصلیہ کی طرف توجہ کم رہ گئی ہے اور علوم آلیہ پر زور زیادہ دیا جانے لگا۔ لیکن اب تقریباً تیس پینتیس سال سے مدارس میں قرآن، حدیث اور فقہ کی طرف توجہ بڑھ رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ رجحان اکثر مدارس میں تقویت پکڑے گا۔ بعض مدارس میں قدیم فلسفہ کی بجائے فلسفۂ جدیدہ کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ بعض دوسرے مدارس میں سیاسیات اور نفسیات کے علوم بھی طلبہ کو پڑھائے جارہے ہیں۔ اگر کوئی اجتماعی ادارہ ایسا ہو جو ان تبدیلیوں کو co-ordinate کر سکے تو مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ہم بھی "اتحاد المدارس العربیہ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں، اس تنظیم کے پیش نظر یہی ہے کہ ہم باہمی تبادلۂ افکار کے ذریعے سے اساتذہ، مہتممین اور ماہرین تعلیم کو جمع کریں اور اگر باہمی مشورے میں کوئی اچھی تبدیلی لاسکیں تو لائیں۔ "وفاق المدارس العربیہ" نے بھی اس سے قبل اس طرح کی کوشش کی ہے۔ لیکن کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوسکا۔ اصل میں اس کے کئی اسباب ہیں کہ ہم کئی باتیں کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ہو نہیں پاتیں، اس میں ہماری گروہی رقابتیں اور کچھ دیگر سماجی کمزوریاں حائل ہوجاتی ہیں، اچھا کام بھی تھوڑے دنوں میں بیٹھ جاتا ہے۔

ہمارے ہاں مدارس میں تعلیم کی بنیاد اساتذہ اور انتظامیہ کا ادب ہے اور تنظیم کی بنیاد بے ادبی ہے...... مہتمم کے ساتھ ٹکرانا۔ اس لیے مہتمم حضرات طلبہ کو منظّم نہیں ہونے دیتے۔

اسی طرح ہمارے ہاں مدارس میں قدیم یونانی فلسفہ تو پڑھایا جاتا ہے اور قدیم یونانی علم کلام بھی پڑھایا جاتا ہے لیکن قدیم یونان کے زمانے کے بعد آج تک فلسفہ میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا اور نہ ہی ان شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے کی سعی کی جاتی ہے جو جدید فلسفیانہ نظریات نے مذہب اور اسلام کے خلاف اذہان میں پیدا کر دیئے ہیں۔ ہاں یہ بات بھی ہے کہ مولانا مودودی اور بعض دیگر اصحاب نے علوم اسلامیہ میں جو نئے انداز میں کتب لکھی ہیں انہوں نے ایک نئے رجحان کو جنم دیا ہے اور یہ نیا رجحان یہ ہے کہ قدیم مابعد الطبیعات کی جگہ ایک جدید اسلامی مابعد الطبیعات کی تشکیل کی جائے جس کے تحت اسلام کے عقائد اصلیہ کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں مدوّن کر کے پیش کیا جائے...... قطع نظر اس کے کہ یہ نئی اسلامی مابعد الطبیعات علوم عقلیہ کے خیالات پر صحیح ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟ دراسات الاسلامیہ جس کی ہم بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے پیش نظر بھی یہی ہے کہ ہم نوجوان علماء کو جمع کریں اور اُن کی توجہ جدید علوم کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کریں اور کمیونزم، سوشلزم، فرائیڈ وغیرہ کے مادیت پسندوں کے نظریات سے ان علماء کو روشناس کرائیں اور ان کے مقابلے میں اسلامی افکار کی حقانیت اور صداقت ثابت کریں۔ دراصل اس ضرورت کا احساس تو پاکستان اور بعض دیگر مسلمان ممالک میں موجود ہے لیکن دقت جو پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ (جدید علوم کو پڑھانے والے ان علوم سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ وہ اعتدال قائم نہیں رکھ سکتے۔)

س: کیا مدارس کے طلبہ معاشرے کی تشکیلِ نو میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں؟

ج: ہمارا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کو جس کے لیے پاکستان وجود میں آیا، قائم کرنے کے لیے سب سے زیادہ ذمہ داری اگر کسی پر عائد ہوتی ہے تو وہ طبقۂ علماء ہی ہے۔ اس لیے کہ یہی وارثِ انبیاء اور وارثِ ختم الانبیاء ہیں لیکن چونکہ عرصۂ دراز سے اور خصوصاً انگریزی حکومت کے دور میں سیاست اور مذہب کی علیحدگی کا تصور پروان چڑھایا گیا ہے اور سماجی مرتبے اور مقام کے اعتبار سے علماء کو بہت ہی گرا دیا گیا ہے، اس لیے اس صورتِ حال کے نتیجے کے طور پر اکثر علماء تو اپنے اندر یہ ہمت اور صلاحیت ہی نہیں پاتے کہ وہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے کوئی سیاسی جدوجہد کر سکیں اور مخالفِ اسلام قوتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ مخالفِ اسلام قوتوں نے علماء کو دباؤ، خوف اور لالچ کے ہتھکنڈوں کے ذریعے جدوجہد کے میدان سے باہر نکال دیا۔ حکومت نے اوقاف کا نظام قائم کر کے دراصل علماء کو اس سیاسی جدوجہد سے الگ کرنے ہی کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود نوجوان علماء کی ایک بڑی تعداد، اور وہ لوگ بھی جنہوں نے مولوی فاضل، ایم اے عربی، ایم اے اسلامیات وغیرہ کی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے، ان کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ اور یہ لوگ اپنے اندر واقعی بڑی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اگر کوئی جماعت لگن کے ساتھ ان لوگوں کو منظم کرنے کا کام کرے تو دس بیس سال کے اندر زندگی کے ہر میدان میں قائدین کی ایسی ٹیم تیار کی جا سکتی ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے پاکستان میں معاشرے کی تشکیلِ نو کا کام انجام دے سکے۔

س: مدارسِ عربیہ کے موجودہ نصابِ تعلیم اور موجودہ ماحول کو دیکھتے ہوئے کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ مدارسِ عربیہ کی تعلیم کی بنیاد پر کوئی سماجی انقلاب آ سکتا ہے؟

ج: سماجی انقلاب اگر ان لوگوں کے ہاتھوں سے آئے گا تو صحیح انقلاب ہوگا، رہا یہ سوال کہ یہ لوگ سماجی انقلاب لائیں گے یا نہیں تو اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہم بھی گذشتہ پندرہ بیس سال سے اسی بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں کہ علماء کو قیادت کا منصب سنبھالنے کی جرأت دلائیں۔ اگر اس انقلاب کی بنیاد خدا ترسی پر ہوگی تو یہ پاکستان اور عالمِ انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوگا، اگر سماجی

انقلاب سے مراد آزادروی، بے حیائی، بے پردگی اور بے اخلاقی ہے تو اس سے تو اب مغربی ممالک بھی تنگ آ چکے ہیں۔ علماء کو چاہیے کہ وہ صحیح اسلامی انقلاب کے علمبردار بنیں۔ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کے افکار کی مقبولیت کا سبب یہ بھی ہے کہ وہ معاشرت، سماج اور سیاست کے میدان میں اسلام کی رہنمائی کا تصور پیش کرتے ہیں، اگر وہ صرف خدا پرستی اور مذہبی عبادات ہی کا تصور پیش کرتے تو شاید یہ افکار نوجوانوں کے لیے اتنے پرکشش نہ ہوتے۔ مولانا مودودی نے نوجوانوں کے ذہنی اضطراب کو سمجھا اور اسلام کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظام کے حوالے سے اُس کے شکوک دور کیے۔ اسی لیے مولانا مودودی کے ساتھ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد ہے اور نوجوانوں کی اسی جماعت سے توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ اگر واقعی محقق اور عالم بن جائیں اور مجاہدانہ جذبے کے ساتھ ساتھ عالمانہ صلاحیتیں بھی پیدا کرلیں تو یہ لوگ قیادت سنبھال سکتے ہیں۔

س: علماء کی جانب سے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر مدارس کے نظام میں جدید علوم شامل کرلیے جائیں تو یہ علوم اسلامی علوم پر فوقیت حاصل کرلیں گے؟

ج: اگر حکومت کی سطح پر علوم اسلامیہ کی ڈگریوں کو دوسری ڈگریوں کے برابر درجہ دے دیا جائے اور اس کا اعزاز اور اکرام عملاً قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو پھر یہ خطرہ نہیں ہے کہ جدید علوم اسلامی علوم پر فوقیت حاصل کر جائیں گے۔

س: اس کے لیے کیا یہ ضروری نہیں ہوگا کہ حکومت دینی تعلیم کے نظام کو اپنی تحویل میں لے لے؟

ج: تحویل میں لے لینے کا سوال منحصر ہے حکمرانوں کی تشخصات پر۔ اگر حکمران ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ جیسے بن جائیں تو کسی کو کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوگا بلکہ سب سے زیادہ خدمتِ دین کا ذمہ دار تو حکمران ہی ہوتا ہے۔۔۔۔۔الناس علی دین ملوکھم۔۔۔۔۔لیکن اگر مدارس کو تحویل میں لینے سے کچھ اور اغراض وابستہ ہوں تو پھر اس کی مزاحمت بھی ہوگی۔ بات اصول کی نہیں، ماحول کی ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر میٹرک تک دیگر علوم کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ بھی نصاب میں لازمی حصے کے طور پر سمو دیئے

جائیں اور اس کے بعد باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے تخصیصی شعبوں......انجینئرنگ، طب، ادب و فنون، علوم عمرانیات، علوم اسلامیہ......میں تخصیصی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور علوم اسلامیہ میں مزید تخصیصی شعبے مثلاً خطابت، تبلیغ، افتاء وغیرہ کے لیے لوگوں کو تیار کیا جائے اور ان کا بھی وہی مقام رکھا جائے جو دوسرے علوم کے حاملین کا ہے تو کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ بہتر نتائج نہ نکلیں۔

گویا دوہرا نظام تعلیم......یعنی سیکولر نظام الگ اور دینی الگ......بالکل غلط چیز ہے، دونوں کو ایک جا ہونا چاہیے۔ نظامِ تعلیم سوائے دینی کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلام تو فن کتابت کو بھی عبادت قرار دیتا ہے۔ جنگ بدر کے بعد بعض قیدیوں کا معاوضہ ہی یہ طے پایا کہ وہ مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں، اب ظاہر ہے کہ کفار قیدیوں نے مسلمانوں کو علوم اسلامیہ تو نہیں پڑھانے تھے تو اسلام اس معاشرت کا سرے سے قائل ہی نہیں۔ اسلام کے نزدیک ایک انجینئر اور ایک امام مسجد اپنی نیت کے اعتبار سے ایک ہی طرح کا ثواب پائیں گے۔ تعلیم سے مراد محض معلومات دینا ہی نہیں بلکہ طلبہ میں اسلامی سیرت و کردار پیدا کرنا بھی ہے۔ اسلام نے تو ہمیں یہ دعا سکھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس علم سے بچائے جو علم نفع نہیں دیتا اور نفع وہی علم دیتا ہے جس پر عمل کیا جائے۔ محض معلومات کافی نہیں۔

س: دینی مدارس کے داخلی ماحول......طلبہ، اساتذہ......کے بارے میں آپ کے مشاہدات اور تاثرات کیا ہیں؟

ج: میں خود اس تجربے سے گزر رہا ہوں، طالب علم بھی رہا ہوں اور بعض مدارس کا مہتمم بھی رہا ہوں۔ مدارس کا داخلی ماحول اور سماجی روایات کچھ خوشگوار نہیں ہیں اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ علوم اسلامیہ کسمپرسی کا شکار ہو گئے، اس لیے معاشرے میں ایسے افراد جو سماجی رتبے اور خاندانی روایات کی وجہ سے صاف ستھرے اور اعلیٰ عادات کے مالک ہوتے ہیں، انہوں نے اس طرف آنا چھوڑ دیا ہے۔

پھر ان مدارس میں طلبہ کے کھانے پینے کا نظام جس ڈھب پر چلتا ہے طلبہ گھروں سے روٹیاں مانگ کر کھاتے ہیں، جن مدارس میں کھانا پکانے کا بندوبست ہے وہ بھی کوئی مناسب نہیں ہے۔ مدارس کا مہتمم

طلبہ کے سامنے، مساجد کے اندر نمازیوں سے اُن کے لیے چندے مانگتا ہے۔ اس طرح طلبہ کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے اور وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر جو کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ بھی نہیں کرتے۔ پھر یہ بھی ہے کہ معاشرتی اصلاح کے بارے میں بھی بڑی مشکل پیدا ہوتی ہے، اب مدارس کی یہ ہے کہ مہتمم تنبیہ کرتا ہے تو طلبہ بھاگ جاتے ہیں۔ چنانچہ مہتمم بھی یہ سوچتا ہے کہ جیسا کچھ بھی شتم پشتم نظام چل رہا ہے چلنے دو۔ دوسری طرف طلبہ بھی سست ہو جاتے ہیں اور تعلیم، صفائی، ستھرائی کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ بس یہی ایک بات قابلِ قدر ہے کہ اس دور میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو مسلمانوں کے لیے مساجد اور مدارس کے لیے خواہ کچے پکے ہی سہی مگر رہنما تو تیار کر ہی رہے ہیں۔

میرا مشاہدہ یہ ہے کہ بالعموم نچلے طبقے کے لڑکے عربی مدارس میں آتے ہیں اور ان میں بھی دستکار، ہاتھ سے کام کرنے والے یعنی بافندے زیادہ ہوتے ہیں۔ طلبہ کا تعلق اکثریت کی حد تک مشرقی پاکستان میں نواکھلی اور مغربی پاکستان میں ہزارہ سے ہوتا ہے یا چھچھ، سوات اور سرحدی علاقوں سے۔

س: کیا ایسا نہیں ہے کہ عربی مدارس بعض علاقوں کے طبقہ غرباء کے بچوں کی معاشی کفالت کا کام بھی کر رہے ہیں؟ مدارس میں غریب بچوں کو کھانا، رہائش اور جیب خرچ بھی مل جاتا ہے۔

ج: یہ By-product ہے۔ لیکن بنیادی وجہ یہ نہیں ہے، اس لیے کہ غریب سے غریب آدمی بھی یہ سمجھتا ہے کہ مولوی بن کر اُن کا بیٹا کوئی بہتر معاش نہیں کما سکے گا۔ مزدور اور چپڑاسی بن کر، کلرک اور مزدور اور استاد بن کر، اور اب حال میں ملک سے باہر جا کر، زیادہ پیسے کما لے گا۔ البتہ عملی شکل میں یوں ہوتا ہے کہ غریب والدین دوسری تعلیم تو دلوا نہیں سکتے، بچوں کو دینی اداروں میں بھیج دیتے ہیں۔

س: دینی مدارس میں طلبہ کی تنظیموں کے قیام کے امکانات کتنے ہیں؟ کیا دینی مدارس کے طلبہ بھی منظم ہو کر ملکی سیاست میں وہ رول ادا کر سکتے ہیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ ادا کر رہے ہیں نیز خود مدارس میں اپنی صورتِ حال کی بہتری کے لیے کیا طلبہ منظم ہو کر کوئی مطالبات وغیرہ پیش کرتے ہیں؟

ج: مستقبل قریب میں اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے اس لیے کہ مہتمم حضرات مدارس میں طلبہ کی تنظیمیں قائم ہی نہیں ہونے دیتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں مدارس میں تعلیم کی بنیاد اساتذہ اور انتظامیہ کا ادب ہے اور تنظیم کی بنیاد بے ادبی ہے...... مہتمم کے ساتھ ٹکرانا۔ اس لیے مہتمم حضرات طلبہ کو منظم نہیں ہونے دیتے۔

لیکن یہ بھی ہے کہ طلبہ اور مہتمم حضرات چونکہ ایک ساتھ رہتے ہیں اس لیے طلبہ کو مہتمم حضرات کی کمزوریوں کا بھی علم ہوتا ہے، اُن کی آمدنیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ یہ رجحان بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ جو مہتمم ذرا اچھی حالت میں رہتے ہیں، طلبہ اُن پر اعتراض کرتے ہیں کہ زکوٰۃ اور خیرات کے پیسے لا کر خود ٹھاٹھ سے رہتے ہو اور ہمیں سہولتیں نہیں دیتے۔ تمہارے گھر میں گوشت پکتا ہے اور ہمیں دال کھلاتے ہو، خود اچھے کپڑے پہنتے ہو اور ہمیں کھدر پہناتے ہو۔ بعض مہتمم حضرات تو اب اسکوٹروں اور موٹر گاڑیوں کے مالک بھی ہیں تو طلبہ اور مہتمم حضرات کے درمیان اور زیادہ طبقاتی کشمکش سامنے آ گئی ہے۔ بہر حال طلبہ کی تنظیمیں ابھی تک تو برائے نام سی ہیں لیکن اب جبکہ حکومت بار بار مدارس کو اپنی تحویل میں لینے کا اعلان کر رہی ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مقام پر آ کر دینی مدارس کے طلبہ بھی اس مطالبے میں شریک ہو جائیں۔ ابھی حال ہی میں دینی مدارس کے طلبہ نے یہ مطالبہ بھی شروع کر دیا ہے کہ بسوں اور ریل گاڑیوں میں اُن کو بھی کرائے میں وہ رعایت دی جائے جو دوسرے طلبہ کو حاصل ہے۔ اب یہ مطالبہ مان لیا جائے تو پھر دینی مدارس کے طلبہ کو Identity cards بھی رکھنے ہوں گے اور یہ امر ان مدارس کو تحویل میں لینے کی طرف ایک پیش قدمی کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی

مفتی، مدرسہ اشرفیہ، لاہور

۲۰۔ اپریل ۱۹۷۵ء

آپ کے والد گرامی کا نام سعید احمد تھا۔ آپ ان خوش نصیب حضرات میں سے تھے جن کو خانقاہ اشرافیہ بون میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے زیرِ سایہ عرصہ دراز تک رہنے کا شرف نصیب ہوا۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی بیٹی محترمہ آپ کے عقد میں تھیں۔ اس طرح آپ کو حضرت تھانوی کی دامادی کی سعادت بھی حاصل تھی اور آپ حضرت تھانوی کے اھلِ خانہ میں شامل تھے۔ اس بناء پر آپ کو خانقاہ اشرفیہ کی آخری یاد سمجھا جاتا تھا۔ آپ یکم شوال ۱۳۲۲ھ، ۱۹ دسمبر ۱۹۰۳ء کو قصبہ بھون، ضلع مظفر نگر، ھندوستان میں پیدا ھوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم والد گرامی کے علی گڑھ کے قیام کے دوران جامعہ علی گڑھ کے زیر انتظام مدرسہ میں حاصل کی۔ بعد ازاں آپ مولد بھون (ھندوستان) میں معروف دینی مدرسہ امدادیہ میں پڑھتے رھے۔ پھر جلال آباد کے معروف دینی مدرسہ سے شیخ اشفاق الرحمان کاندھلوی کے حلقہ درس میں متوسط درجہ تک کی کتابیں پڑھیں۔

اس کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور (ہندوستان) میں داخل ہوئے اور یہیں سے سند فراغت حاصل کی۔ اس مدرسہ میں آپ کے اساتذہ گرامی حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری شامل تھے۔ آپ ان کے منظورِ نظر رہے۔ ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء میں دورہ حدیث کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی تو مولانا سہارنپوری نے آپ کو انعام میں جیبی گھڑی عنایت فرمائی جو اس زمانے کا نہایت قیمتی انعام تھا۔ آپ کے دیگر ممتاز اساتذہ میں حضرت مولانا عبدالرحمان کامل پوری، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی اور حضرت حافظ عبداللطیف شامل تھے۔ علاوہ ازیں حضرت عبدالوحید سنبھلی اور حضرت نگینوی بھی آپ کے اساتذہ گرامی میں شامل تھے۔ آپ نے ۱۳۴۴ھ/۲۶۔۱۹۲۵ء میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے دست مبارک پر بیعت کی۔

فراغت کے بعد آپ نے اپنے اساتذہ گرامی حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے حکم پر حیدر آباد دکن کے مدرسہ میں تدریسی خدمات کا آغاز کیا اور ایک مدت تک مدرسہ انتظامیہ حیدر آباد، دکن میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ بعد ازاں ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں آ گئے اور ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء تک اسی مدرسہ میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ مظاہر العلوم میں آپ نے دودو رسائل "المظاہر" اور "دینداری" تحریر کیے جو دعوت و تبلیغ میں معروف رہے۔ ۱۳۴۰ھ/۱۹۴۱ء میں حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانوی علیل ہوئے تو آپ ان کے حکم سے خانقاہ اشرفیہ، بھون (ہندوستان) کے مدرسہ

امداد العلوم میں فتویٰ نویسی اور تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے احکام القرآن کی تالیف کے لیے اپنے متوسلین میں سے جن چار علماء کو منتخب فرمایا وہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی محمد تقی، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی تھے۔

۱۳۷۰/۱۹۵۱ء میں آپ نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت اختیار کی اور جامعہ اشرفیہ لاہور میں آگئے اور اس مدرسہ میں تفسیر و حدیث اور دوسرے فنون کی کتب کی تدریسی خدمات میں مصروف ہو گئے اس کے ساتھ ساتھ فتوٰ نویسی کی ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے۔

حضرت مفتی صاحب ایک جلیل القدر استاد، وقت کے جید عالم، سلیم الفکر اور متوازن الرائے مفتی تھے۔عوام اور اھل علم میں آپ کے فتوے، استناد کے لحاظ سے وقیع حیثیت رکھتے تھے۔ ہزاروں طلباء آپ سے مستفید ہوئے اور ہزاروں مسائل میں آپ نے قوم کی رہنمائی فرمائی۔

قرآن و سنت اور دیگر علوم و فنون میں ماھرانہ دسترس کے علاوہ تصنیف و تالیف اور شعر و شاعری کا بھی اعلی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ آپ کے علم سے متعدد عربی، فارسی اور اردو تحریرات کے علاوہ قصائد و مراثی اور عمدہ نظموں نے بے پناہ مشاغل کے باوجود طبیعت میں شگفتگی اور زندہ دلی تھی۔

آپ آخر عمر میں ایک عرصہ تک ضعف میں مبتلا رہے۔ سماعت اور بصارت بھی

کمزور تھی لیکن فضل الٰہی سے آخر تک فتویٰ نویسی کی خدمات سر انجام دیں اور اسی دور میں احکام القرآن کی تالیف کمل فرمائی۔ بالآخر بروز اتوار مورخہ ۲۰ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ، ۲۴ دسمبر ۱۹۹۴ء کو لاھور میں وصال فرمایا اور وھیں دفن ھوئے۔

جدید تعلیم

انگریزوں نے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں اس وجہ سے قائم کی تھیں کہ مسلمان مسلمان نہ رہیں اور مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں انگریزوں کی محبت اور انگریزوں کے طور طریقے پیوست کر دیئے جائیں۔ یہ نظامِ تعلیم مسلمانوں کی ہر آنے والی نسل کو گمراہ کر رہا ہے اور انہیں اسلام سے دُور لے جا رہا ہے۔

مدارس عربیہ کا نظام تعلیم

مقصد تعلیم

مدرسۂ نظامیہ بغداد میں ہارون الرشید کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ روایت ہے کہ ایک بار خلیفہ ہارون الرشید مدرسہ میں گیا اور طلبہ سے پوچھنے لگا کہ وہ کس مقصد کے لیے اس مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ایک نے جواب دیا کہ میرا باپ ''محتسب'' کے عہدے پر فائز ہے، بس چاہتا ہوں کہ میں بھی پڑھ لکھ کر محتسب بن جاؤں اور اپنے والد کی جگہ لے لوں۔ دوسرے طالب علم نے کہا کہ وہ ''قاضی'' بننا چاہتا ہے، تیسرے نے کہا کہ میں ''مفتی'' بنوں گا۔ لیکن ہارون الرشید نے یہ سوال جب امام غزالی سے کیا جو اس وقت طالب علم تھے تو انہوں نے کہا کہ وہ اس لیے پڑھ رہے ہیں کہ اپنا دین درست کریں اور دوسروں کو بھی دین سمجھائیں۔

چنانچہ اس سے مدارسِ دینیہ کے نظامِ تعلیم کا یہ مقصد نکلتا ہے کہ دین کو سمجھنا اور سمجھانا۔ بالفاظ دیگر دین کا تحفظ۔ دینی مدارس بھی اگر یہ کام نہ کریں اور دینی علوم پڑھانا بند کر دیں تو آپ یہ بتائیں کہ دوسرا کون سا ادارہ ہے جو ان کی جگہ یہ فریضہ انجام دے گا، یہ محض مدارس عربیہ اور اسلامیہ ہی کا کارنامہ ہے کہ اسلامی علوم کی اشاعت و تعلیم کا کام جاری ہے۔

پاکستان بننے کے بعد اس ملک میں کم از کم ۵ سو نئے دینی مدارس قائم ہوئے۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سال تقریباً دو ہزار طلبہ دینی علوم کی تحصیل سے فارغ ہوتے ہیں۔

کوئی ایسا مسئلہ ہے ہی نہیں جس کا حل قرآن وسنت میں موجود نہ ہو اور جس کے بارے میں فقہاء نے رائے نہ دی ہو۔ چنانچہ ہر چیز ''پکی پکائی'' موجود ہے۔اجتہاد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

جدید علوم اور نصاب مدارس

جدید علوم کو اور علوم عمرانیات وغیرہ کو دینی مدارس کے نصاب میں شامل کرنا انتہائی خطرناک ہے۔ جدید علوم وہی علوم ہیں جن سے طلبہ کو اچھی ملازمتیں ملتی ہیں اور حکومت اور پرائیویٹ اداروں میں جن کی مانگ ہے۔ اگر دینی مدارس میں بھی ان علوم کی تعلیم کو شامل کر لیا گیا تو سارے طلبہ ان علوم کے پیچھے پھر جائیں گے۔ اس لیے کہ ان علوم کی تحصیل سے انہیں عمدہ عمدہ ملازمتیں مل سکیں گی۔ پھر سوال یہ ہے کہ مسجدوں اور مدرسوں کو کون چلائے گا۔

اس میں ایک اور قباحت یہ بھی ہے کہ اگر جدید علوم کو شاملِ نصاب کر لیا گیا تو طلبہ کے ذہن میں خواہ مخواہ اسلام اور اس کے عقائد کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوں گے اور وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اسلامی علوم کی تحصیل نہیں کر سکیں گے۔

اجتہاد

میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا دینی مدارس کا مقصد صرف قدیم اسلامی روایت کا تحفظ ہی ہے، اس روایت کو ترقی دینا اور اسے آگے بڑھانا بھی ہے.....مولانا نے فرمایا کہ ''دینی روایت کو آگے بڑھانے'' کی اصطلاح خطرناک ہے۔اس لیے کہ اس طرح ہر شخص کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی مطالعے سے اپنی ذاتی رائے قائم کرتا رہے اور پھر اس رائے کو قرآن وسنت سے منسوب کرتا رہے۔ ابوالاعلیٰ مودودی اور غلام احمد پرویز یہی کام کر رہے ہیں۔

اجتہاد کے ضمن میں ایک اور سوال کے جواب میں مولانا مفتی صاحب نے کہا کہ اوّل تو کوئی ایسا مسئلہ ہے ہی

نہیں جس کا حل قرآن وسنت میں موجود نہ ہو اور جس کے بارے میں فقہاء نے رائے نہ دی ہو۔ چنانچہ ہر چیز "پکی پکائی" موجود ہے۔ اجتہاد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دوم، یہ کہ اجتہاد کے لیے جو ضروری شرائط ہیں وہ چوتھی صدی ہجری کے بعد کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو ہر طرح سے پوری کرتا ہو۔ اجتہاد کی اہلیت کے لیے مولانا نے جو شرائط گنوائیں اُن میں یہ شرائط بھی شامل تھیں:

۱۔ قربتِ عہدِ نبویؐ..... جس قدر کوئی شخص رسول کریمؐ سے زمانی طور پر دُور ہوگا، اتنا ہی اجتہاد کے لیے نااہل ہوگا۔

۲۔ آیاتِ قرآنی جو احکام سے متعلق ہیں اسے ازبر ہونی چاہئیں۔

۳۔ احکام سے متعلق احادیث بھی اسے ازبر ہونی چاہئیں (شرائط ۲ اور ۳ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ موجودہ دور میں لوگوں کے حافظے ناقص ہو گئے ہیں، لہٰذا یہ شرائط بھی کوئی شخص پوری نہیں کر سکتا)۔

۴۔ اجتہاد کرنے والا شخص بے حد ذہین ہو۔

۵۔ قدیم فقہاء کے کام پر پوری طرح نظر ہو

۶۔ متقی، خداترس، پرہیزگار مسلمان ہو۔

مولانا نے فرمایا کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد ہمیں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو یہ ساری شرائط پوری کرتا ہو، لہٰذا چوتھی صدی ہجری کے بعد جس کسی نے بھی اجتہاد کیا ہے وہ درست نہیں ہے۔

....

مولانا نے دورانِ گفتگو اپنی ایک کتاب کا بھی ذکر کیا جو "دینی مدارس" کے عنوان سے انہوں نے لکھی ہے۔

مولانا
سید ابوبکر غزنوی

صدر شعبہ علوم اسلامیہ

پاکستان انجینئرنگ یونیورسٹی، لاہور

۲۳۔ اپریل ۱۹۷۵ء

سیّد ابوبکر غزنوی سیّد دائود غزنوی کے گھر ۲۲مئی ۱۹۲۷ء کو امرتسر کے معروف خاندان غزنیہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر اور لاہور میں حاصل کی۔ ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے عربی زبان و ادبیات میں ایم اے کیا اور یونیورسٹی میں اوّل آنے کی بنیاد پر سونے کے تمغہ کے مستحق قرار پائے۔ بعد میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ علوم دینیہ کی تحصیل اپنے والد بزرگوار مولانا سیّد دائود غزنوی، حافظ محمد گوندلوی اور مولانا شریف الله سے کی۔

پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کر کے اسی سال اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں عربی زبان و ادب کے استاد مقرر ہوئے۔ بعد میں شعبہ عربی اور شعبہ علوم اسلامی کے سربراہ رہے۔ استاد کی حیثیت سے محنتی، شفیق اور نہایت خوش اخلاق تھے۔ پروفیسر حمید احمد خان، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ان کی علمی استعداد اور صلاحیتوں کے مداح تھے۔ انھوں نے اوریئنٹل کالج کے شعبۂ عربی میں جزو قتی استاد کی حیثیت سے سیّد ابوبکر غزنوی کی خدمات حاصل کیں۔ بعد میں اسلامیہ کالج سے انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں چلے گئے۔ ستمبر ۱۹۷۵ء میں انھیں اسلامی یونیورسٹی، بھاولپور کا وائس چانسلر نامزد کیا گیا۔ انھوں نے دینی طرز کے

ایک مدرسے کو جدید یونیورسٹی میں بدلنے کے لیے شب و روز کام کیا۔ اپریل ۱۹۷۶ء میں مسلمانوں کے علوم و فنون کے تعارف کے لیے لندن میں ایک اسلامی میلہ (Islamic Festival) منعقد کیا گیا۔ اسلامی میلے میں حکومت پاکستان کے ایک وفد میں شرکت کیلئے ۱۴ اپریل ۱۹۷۶ء کو لندن پہنچے۔ اسی روز ۱۴ اور ۱۵ اپریل کی درمیانی شب سڑک پار کرتے ہوئے کار کے حادثے میں ان کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ ان کا مقالہ اسلامی میلے میں ان کے دوست ڈاکٹر شیر محمد زمان نے پڑھا۔ مولانا سیّد ابوبکر غزنوی ویسٹ منسٹر ہسپتال، لندن میں زیرِ علاج تھے کہ ۲۵ اپریل کو دیارفرنگ میں جان، جان آفرین کے سپرد کی۔ چار دن کے بعد ان کی میت لاھور پہنچی اور اسی روز اپنے والد ماجد مولانا دائود غزنوی مرحوم کے پہلو میں دفنائے گئے۔ مرحوم بہت پڑھنے والے شخص تھے اور دین و ادب کے تمام ھی موضوعات ان کے مطالعہ میں تھے۔ اسلامی مصادر پر ان کی براہِ راست نظر تھی اور غیر مسلم مستشرقین کا سرمایہ افکار ان کے سامنے تھا۔ اس پر مستزاد ذھانت و فطانت تھی۔ ان کا قلمی سرمایہ متعدد کتابچے اور مولانا سیّد دائود غزنوی کی سوانح حیات "سیّد دائود غزنوی (سیدی و ابی)"۔

مولانا غزنوی نے ۱۹۵۶ء میں رسالہ "توحید" (امرتسر) کا احیاء لاھور سے کیا جو ڈیڑھ دو سال چھپتا رھا۔ مرحوم تحریر کی نسبت تقریر کے میدان میں زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ ان کی تقریروں میں دل و دماغ دونوں کی تسکین کا سامان موجود ھوتا تھا۔ علم و فضل کے ساتھ عام آدمی کی دلچسپی کا سامان بھی ھوتا تھا۔ اپنے حسنِ اخلاق اور تواضع کی بنا پر آپ تمام مسالک کے علماء میں ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

دینی مدارس کا نظام

میں اکثر انگریزوں کی اس بات پر زور دیا کرتا ہوں کہ انہوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ اور لطیف انداز میں دینی درس گاہوں کے نظام کو برباد کیا۔ انگریز نے کہا کہ میں چونکہ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل کا قائل ہوں اس لیے ان درس گاہوں کو بند نہیں کروں گا اور انہیں چلنے دوں گا لیکن ساتھ ہی اُس نے یہ بات کہی کہ میرے دفتروں میں ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو کام نہیں ملے گا۔ یہ تعلیم میرے آفس میں کام نہیں دے گی۔ نیز یہ کہ ہم ان مدارس کو کوئی گرانٹ وغیرہ بھی نہیں دیں گے۔ اگر کوئی شخص اس نظام کو جاری رکھنا چاہے تو اُسے مکمل آزادی ہے لیکن اُسے یہ نظام اپنے امور پر ہی چلانا پڑے گا۔ یہ دراصل ایک کاری وار تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظامِ تعلیم معاشرے سے کٹ کر رہ گیا۔ دوسری طرف یہ مدارس دیوبندیت، بریلویت اور اہل حدیثیت کی حیثیت سے پنپتے رہے لیکن اسلامی درس گاہوں کی حیثیت سے ان کی اہمیت کم ہوتی گئی۔

دوسری طرف نتیجہ یہ نکلا کہ تمام ذہین بچے کالجوں کا رُخ کرنے لگے اور معاشرہ کا Poorest Stuff ان مدارس میں آنے لگا۔ جو ہل نہیں چلا سکتا تھا، جو سب بھائیوں میں سے سب سے زیادہ بے کار، اپاہج اور معذور ہوتا تھا، وہ دینی مدرسے میں بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ بات میں اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ابتدائی Stuff بہت اہم ہوتا ہے۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا ہے کہ انسانوں میں کوئی سونے کی کان ہوتا ہے تو کوئی چاندی کی کان۔ ہر شخص کے مخصوص Talents ہوتے ہیں۔ چنانچہ دینی درس گاہوں کا یہ Stuff جب مولوی بنا تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا ذہنی معیار کیا ہوتا ہوگا۔ اس ''غریب'' اور ناکارہ Stuff میں جو نسبتاً بہتر لوگ تھے وہ 'مولانا' بن گئے..... تو میری نگاہ میں ساری صورت حال میں سب سے خراب بات یہ ہے کہ ان مدارس میں جو Stuff آتا ہے، وہ معاشرے کی تلچھٹ ہوتی ہے۔

دوسری خرابی ان اداروں میں یہ ہے کہ یہ ادارے شدید ''انجماد'' کا شکار ہیں۔ ان کا نصاب وہی ہے جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ مستقلاً ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں اور اپنے اندر کوئی تبدیلی لانے پر تیار نہیں ہیں۔

تقسیم کے بعد تو یہ نظام پہلے سے بھی زیادہ برباد ہوتا نظر آتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد آج تک کوئی ایسا حکمران نہیں آیا جس کی یہ خواہش رہی ہو کہ وہ ان مدارس کو اس طرح منظم کرے کہ یہاں سے ذہین اور راسخ العقیدہ مسلمان پیدا ہو سکیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ ان درسگاہوں سے جو لوگ نکلتے ہیں، وہ اسلام کی خدمت تو کم کرتے ہیں، اپنے فرقے کی خدمت زیادہ کرتے ہیں۔ بلکہ بحیثیت اسلام کے یہ لوگ اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان لوگوں کو ''بشر'' اور ''نور'' کے مسائل تو خوب سمجھ میں آتے ہیں لیکن عالمِ اسلام اور پاکستان کو اس وقت جو مسائل درپیش ہیں وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اسی وجہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ادارے اسلام کے cause کو بین الاقوامی اور قومی سطح پر نقصان پہنچا رہے ہیں۔

دینی مدارس کے نظام میں تبدیلی کی صورتیں

ہمیں ایسی دینی درس گاہوں کی ضرورت ہے جہاں بیک وقت جدید اور قدیم علوم پڑھائے جائیں، ایسے اساتذہ رکھے جائیں جو جدید اور قدیم دونوں طرز کے علوم کے ماہر ہوں، جدید یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی ہوں اور مستند علماء بھی ہوں۔ پھر ان مدارس کے نصاب کو اس طور پر ازسرِ نو مرتب کیا جائے کہ دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے والے مبلغ پیدا ہو سکیں۔ میری رائے میں اب ایسے مبلغ پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں جو موجودہ دور کی زبان اور اسلوب میں اسلام پر گفتگو کر سکیں۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ درس گاہیں مسلمان اہلِ قلم پیدا کریں، مقرر پیدا کریں جو اردو، انگریزی اور عربی، ان سب زبانوں میں لکھ سکیں اور بول سکیں۔ اس دور کے اسلوب کو سمجھیں اور مختلف تحریکیں جو اس دور میں چل رہی ہیں، اُن کا مطالعہ بھی ان کے نصاب میں شامل ہو۔ مثلاً کمیونزم، سوشلزم، جدلیاتی مادیت وغیرہ۔ ان طالب علموں کو پورے اعتماد کے ساتھ مارکس، لینن اور ماؤ کے افکار کا مطالعہ کرایا جائے اور پھر پورے دلائل کے ساتھ حضرت محمدؐ کی تعلیمات کی برتری ان افکار پر ثابت کی جائے، یعنی دلائل کے ساتھ طلبہ کو مطمئن کیا جائے کہ ہم کیوں ان افکار کے مقابلے

مدارس دیوبندیت، بریلویت اور اہل حدیثیت کی حیثیت سے پنپتے رہے لیکن اسلامی درس گاہوں کی حیثیت سے ان کی اہمیت کم ہوتی گئی۔

میں رسول کریمؐ کو ان کی تعلیمات کو prefer کرتے ہیں۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ان مدارس کو گورنمنٹ support کرے، یہ ادارے نہ دیوبندی ہوں، نہ بریلوی اور نہ اہل حدیث، بلکہ صرف اسلامی ادارے ہوں۔

اصل میں جو بات ان مدارس کو چلانے کے لیے سمجھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اسلام کوئی ایسا مضمون نہیں ہے جو ہوا میں پڑھایا جا سکے، اس کا تعلق ان تمام مسائل سے ہے جو معاشرے کو درپیش ہیں۔ آج کے دور میں جس شخص کو سوشلزم کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ہیں، اُسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسلام پر بات کرے۔ اسلام اور سوشلزم کی جنگ آج کے دور کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ جو مولوی صاحب آج سوشلزم کے بارے میں اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں، وہ کسی ذہین آدمی کو متاثر نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ بات ضروری ہے کہ جدید علوم عمرانیات کے وہ مباحث جن کا تعلق اسلامی نظریۂ حیات سے ہے اور جدلیاتی مادیت وغیرہ بھی نصاب میں شامل ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ''مولوی'' کی جان محنت سے جاتی ہے۔ مدارس میں تعلیم کے دوران جو کچھ وہ پڑھ لیتے ہیں، اُسی پر اکتفا کرتے ہیں، بعد میں مطالعہ، بالکل نہیں کرتے، اس لیے ضروری ہے کہ دوران تعلیم انہیں یہ علوم پڑھا دیے جائیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم مسائل سے صرفِ نظر نہ کریں بلکہ مسائل کو face کریں اور جدید فلاسفہ کو بھی نصاب میں شامل کریں مثلاً برٹرینڈ رسل کے افکار کا مطالعہ کرایا جائے۔ پرانے زمانے کی منطق اور فلسفہ کی کتب کو نصاب سے خارج کر دینا چاہیے۔

مدارس میں عربی گرائمر پر دس دس کتابیں پڑھا کر طلبہ کو بے دم کر دیا جاتا ہے۔ جب طالب علم یہ کتابیں ختم کر لیتا ہے تو اتنا تھک جاتا ہے کہ عربی زبان سیکھنے سے اُس کی رغبت ختم ہو جاتی ہے۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو مدارس میں عربی گرائمر پر دس دس کتابیں پڑھا کر طلبہ کو بے دم کر دیا جاتا ہے۔ جب طالب علم یہ کتابیں ختم کر لیتا ہے تو اتنا تھک جاتا ہے کہ عربی زبان سیکھنے سے اُس کی رغبت ختم ہو جاتی ہے۔

اس ساری بات کے باوجود یہ بات بھی ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ہم ان مدارس سے شکوک میں مبتلا لوگ پیدا نہ کریں بلکہ ایسے لوگ پیدا کریں جو راسخ العقیدہ مسلمان ہوں اور اپنی زندگیاں اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر سکیں۔

اجتہاد کی گنجائش

اجتہاد کا دروازہ کبھی بھی بند نہیں ہوا۔ فقہ سے متعلق ہمارے ہاں جو دو مکاتیب ہیں..... یعنی ایک تو جامد مقلد ہیں اور آئمہ کرام کے اقوال کو حرفِ آخر جانتے ہیں اور دوسرے وہ جو صحیح بخاری ہی کو فقہ مانتے ہیں......... حالانکہ قرآن اور صحیح بخاری بجائے خود قانون نہیں بلکہ قانون کے sources ہیں، قانون ان سے اخذ (deduct) کیا جاتا ہے۔ آئمہ کرام نے جو فقہ کی تشکیل کی، وہ اسی اصول کے مطابق تھی، بلاشبہ یہ لوگ عظیم تھے اور انہوں نے عظیم کام کیا لیکن ان کی عظمت سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ قانون کے ارتقاء کو روک دیا جائے۔ قانون کے ارتقاء کا رک جانا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ ان آئمہ کرام نے جو کام کیا اُس کو سامنے رکھ کر ہر دور میں فقہ کے ارتقاء کو مسلسل جاری رہنا چاہیے لیکن یہ بھی ہے کہ اجتہاد بالکل بے مہار نہ ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ جو شخص بھی قرآن اور حدیث کی تعلیمات کو پس پشت ڈالنا چاہے، وہ اجتہاد کرنے لگے۔ یہ دراصل اجتہاد کا استحصال ہوگا۔

قانون کے ارتقاء کا رُک جانا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔
ان آئمہ کرام نے جو کام کیا اُس کو سامنے رکھ کر ہر دور
میں فقہ کے ارتقاء کو مسلسل جاری رہنا چاہیے۔

میرا خیال یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں کتاب وسنت میں واضح احکامات موجود نہ ہوں، اُس سے متعلق اجتہاد کیا جا سکتا ہے، یہ بات تو ناگزیر ہے، لیکن جن مسائل پر قرآن اور سنت میں واضح احکامات ہوں اور جن پر تمام آئمہ کا اتفاق ہو، اُن میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

پھر یہ بھی ہے کہ اجتہاد کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں۔ ہر ایرا غیرا اجتہاد نہیں کر سکتا، پھر ہر وہ شخص جو قرآن اور حدیث کا طالب علم ہو، وہ بھی اجتہاد کا اہل نہیں ہے۔ اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ مجتہد......

۱) قرآن، حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، اصولِ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ پر اس کی گہری نظر ہو۔

۲) آئمہ اربعہ کے کام پر گہری نظر ہو۔

۳) اُس کا کردار خالص اسلامی ہو، یعنی وہ متقی اور پرہیز گار ہو، اس کی زندگی بے داغ ہو،...... میرا خیال ہے کہ ہماری عدالتوں کے جج حضرات ہمیں اس سلسلے میں مدد تو دے سکتے ہیں لیکن یہ حضرات خود اجتہاد نہیں کر سکتے۔

۴) جدید علوم اور جدید دور کے پیچیدہ مسائل پر بھی اس کی نظر ہو۔

ملک غلام علی

معاونِ خصوصی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

لاہور، ۲۲۔ اپریل ۱۹۷۵ء

ملك غلام علی (پیدائش فروری ۱۹۲۰ء کو کھیسکی ، ضلع خوشاب۔ وفات ۲۶ ستمبر ۱۹۹۴ء لاهور) اعوان خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے والد ملك احمد خاں ایك دین دار اور تهجد گزار انسان تھے۔ پرائمری تك تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور پھر گورنمنٹ هائی اسکول نوشهره (خوشاب) میں داخل هوئے۔ یهیں پر ان کے هندو استاد انت رام نے علامه محمد اقبال کے کلام سے تعلق جوڑا۔ اسی اسکول کے استاد مولوی عبدالغفور نے غلام علی کی ذهانت دیکھ کر کها: "یهاں کے بجائے مناسب هوگا که لاهور کے کسی اچھے اسکول میں پڑھو۔" اس طرح انهوں نے انجمن حمایت اسلام لاهور کے اسلامیه هائی اسکول شیرانواله گیٹ میں داخله دلوایا۔ یهاں سے میٹرك کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کیا اور ۱۹۳۷ء میں اسلامیه کالج (ریلوے روڈ) لاهور میں انٹرمیڈیٹ آرٹس میں داخله لیا۔ ملك صاحب

کے دوست اور کلاس فیلو سابق سول سرونٹ بشیر ساجد کے بقول :"ملک غلام علی کی انگریزی میں استعداد قابل رشک تھی۔کالج میں ایک روز استادِ محترم نے ہم سب طالب علموں سے فرداً فرداً پوچھا آپ کیا بننا چاہتے ہیں؟"کسی طالب علم نے کہا ڈپٹی کمشنر، کسی نے پولیس اور کسی نے فوج وغیرہ کو اپنا آئیڈیل قرار دیا لیکن جب غلام علی صاحب کی باری آئی تو دیہی وضع قطع کے اس سادہ مزاج لڑکے نے سنجیدگی سے کہا: "سر، میں کسی اسکول میں ٹیچر بننے کی کوشش کروں گا۔" اس پر پوری کلاس میں قہقہہ بلند ہوا۔ ابھی ایف اے کے طالب علم تھے کہ شادی ہو گئی اور ایف اے کا امتحان بھی درجہ اوّل میں پاس کیا۔ پھر ۱۹۳۹ء میں بی اے کا داخلہ بھی اسلامیہ کالج ھی میں لیا۔ یہاں پر انھوں نے انگریزی ادبیات، فلسفہ، ریاضی اور آپشنل فارسی کا انتخاب کیا۔ انگریزی کے استاد پروفیسر حمید احمد خاں، فلسفہ کے اُستاد ڈاکٹر محمد سعید اثر، فارسی کے استاد ڈاکٹر محمد باقر تھے۔ انٹرمیڈیٹ کے زمانے ھی سے باقاعدگی سے مولانا احمد علی لاھوری کے درس قرآن کی کلاس سے وابستہ ہو گئے اور قرآن کریم کا مکمل درس لیا۔ یہیں پر مولانا احمد علی لاھوری کے بیٹے حبیب الرحمان سے دوستی ہو گئی اوریہ دونوں دوست ادلے کے بدلے میں عربی اور انگریزی پڑھنے پڑھانے لگے۔ ملک غلام علی کی انگریزی اچھی تھی اور حبیب الرحمان کی عربی، دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ اسی دوران حبیب الرحمان نے ملک غلام علی سے کہا: "مولانا مودودی کی کتابیں بھی پڑھا کرو" یوں پہلی مرتبہ ان سے مولانا کا نام سُنا۔ پھر کالج میں ایک روز مولانا عبدالستار خان نیازی نے توجہ دلائی کہ: "ماہ نامہ ترجمان القرآن کا مطالعہ کیا کریں"۔

ستمبر ۱۹۳۹ء کے اوائل میں اسلامیات کے اُستاد مولانا محمد عمر خاں تونکی کی

ریٹائرمنٹ کے بعد، کالج انتظامیہ نے مولانا مودودی کو اعزازی طور پر ڈین علوم اسلامیہ کی حیثیت سے مقرر کیا۔ یہاں پر مولانا مودودی نے تمام کلاسوں کے طلبہ کو علوم اسلامیہ کا سبق پڑھاناشروع کیا۔ وہ ایک ایک کلاس کو حبیبیہ ھال میں مشترکہ طورپر، لائوڈ اسپیکر پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان کے ایسے براہِ راست شاگردوں میں بہت سے نامور لوگ شامل رہے، تاہم چند نام یہ ہیں: ڈاکٹر فضل الرحمٰان، ملک غلام علی، بشیر ساجد، شیخ فقیر حسین، چودھری غلام جیلانی وغیرہ۔ چند ماہ کے لیکچر سننے کے بعد ملک غلام علی نے طے کیا کہ یہ تعلیم حاصل کر کے میں انگریزی نظام کا کل پرزہ نہیں بنوں گا۔ اس طرح بی اے کے امتحان سے دو ڈھائی ماہ پہلے ہی کالج چھوڑ دیا، اور اپنی خدمات مولانا مودودی کے سپرد کر دیں۔ میٹرک اور انٹر کی سندیں یہ کہہ کر جلا دیں کہ جب اس راستے پر نہیں چلنا تو کاغذ کے ان ٹکڑوں کو سنبھال کر رکھنے کا مطلب کیا؟ اب انھوں نے غم روزگار سے نبٹنے کے لیے پرائیویٹ ٹیوشن کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی پوری توجہ عربی زبان، گرامر اور ادب کو پڑھنے پر لگادی۔ لاھور میں سیّد احمد الحسنی (برادر مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی) سے عربی کا باقاعدہ درس لیا، پھر مولانا طاھر سورتی سے عربی گرامر پڑھی، جبکہ قرآن و حدیث کا متن مولانا مودودی کی رھنمائی میں پڑھا۔

اگست ۱۹۴۰ء میں مولانا مودودی نے لاھور میں جماعتِ اسلامی کا تاسیسی اجلاس منعقد کیا، ملک غلام علی اس کے تاسیسی ارکان میں شامل ھوگئے۔ کچھ

عرصے بعد مولانا مودودی نے ملک صاحب کو ماہ نامہ ترجمان القرآن کی ترسیل، مکتبہ ترجمان القرآن کی معاونت اور خط و کتابت میں ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری سونپی۔ ان گراں بار ذمہ داریوں کی بجا آوری کے باوجود وہ مولانا مسعود عالم ندوی سے عربی کا درس لیتے اور استعداد کار بڑھاتے رہے۔یوں ذاتی محنت اور خدا داد صلاحیت کے بل پر حدیث اور فقہ میں خصوصی درک حاصل کیا۔ مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ کئی بار چاند کی روشنی میں بھی مطالعہ کرتے رہتے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد دارالاسلام، جمال پور پٹھان کوٹ سے ہجرت کر کے لاہور آگئے اور یہاں پر جماعت اسلامی کے مرکزی شعبہ تنظیم سے وابستہ ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں جب مولانا مودودی اور جماعت کے سیکرٹری جنرل میاں طفیل محمد گرفتار کر لیے گئے تو جماعت کے قائم مقام امیر عبدالجبار غازی صاحب نے غلام علی کو جماعت کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے صوبائی انتخابات میں انھیں امیدوار بھی نامزد کیا۔ بعد ازاں مولانا مودودی نے انھیں شعبہ رسائل و مسائل کا ناظم اور پھر معاون خصوصی مقرر کیا۔

دینی امور، فقہ اور اصول قانون پر گھری نظر رکھنے کے سبب جون ۱۹۸۱ء میں صدر پاکستان نے ملک غلام علی صاحب کو فیڈرل شریعت کورٹ میں جسٹس مقرر کیا۔ اس ذمہ داری کو انھوں نے جون ۱۹۸۵ء تک ادا کیا اور پھر شعبۂ رسائل و مسائل میں خدمت دین کے لیے حاضر ہو گئے۔ ملک صاحب آخری عمر میں شوگر

کے عارضے میں مبتلا ہو گئے، لیکن انتقال سے تین روز پہلے تك قرطاس وقلم سے رشتہ منقطع نہ ہونے دیا۔

متعدد بلند پایہ علمی مقالات، ہزاروں دینی خطوط کے علاوہ چند کتب اور تراجم کے نام یہ ہیں:

- خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا جائزہ
- رسائل و مسائل ، ششم، ہفتم
- Why Create Doubts about the Authenticity of Islamic Penalty
- تراجم : سیرت المختار، شیخ مصطفی
- سیرت رسول، ڈاکٹر مصطفی سباعی
- اسلام کا نظام قانون، جسٹس عبدالقادر

دینی مدارس کا نظام

دینی مدارس کا نظام جس دور میں رائج کیا گیا تھا، اُس دور کے تقاضوں کے لحاظ سے اس کی ایک افادیت تھی۔ یہ نظامِ تعلیم دراصل اُس عہد کے سول ملازمین کی تربیت کے لیے مرتب کیا گیا تھا جس طرح آج سول سروس اکیڈیمی وغیرہ میں سرکاری افسران کی تربیت کے لیے تعلیمی پروگرام مرتب کیا جاتا ہے۔ چونکہ اُس زمانے میں اسلامی نظامِ حکومت کے اداروں میں جاری وساری تھا اور اسلامی قانون بھی نافذ تھا، لہٰذا قدرتی بات تھی کہ اس نظامِ تعلیم میں دینی علوم کا حصہ بھی شامل کر لیا گیا لیکن نصاب میں زیادہ حصہ منطق، فلسفہ، ہندسہ، ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور اس طرح کے دوسرے علوم پر مشتمل تھا۔ جو لوگ ان مدارس سے فارغ التحصیل ہوتے تھے وہ حکومت کے اہم مناصب پر فائز ہوتے تھے اور اس طرح طلبہ مدارس میں جو کچھ پڑھتے تھے اُسے عام زندگی میں استعمال بھی کرتے تھے۔

اب المیہ یہ ہوا کہ دینی تعلیم کا یہ نظام اپنی ابتداء سے لے کر آج تک اُس ڈگر پر چل رہا ہے جس پر اُسے ایک خاص دور کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر صدیوں پہلے مرتب کیا گیا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس نظام میں نشو ونما اور ترقی کے امکانات موجود تھے لیکن ان امکانات سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ زمانہ ایک طرف جا رہا ہے تو یہ مدارس کا نظام دوسری طرف۔ یہ نظام نشو ونما، ترقی اور تبدیلی سے یکسر محروم ہے۔ ابھی تک ان مدارس میں فلسفہ اور منطق کے نصاب میں وہ یونانی نظریات پڑھائے جا رہے ہیں جو متروک ہو چکے ہیں۔ مدارس کے منتظمین کا فرض تھا کہ وہ حسبِ ضرورت نصاب میں تبدیلیاں کرتے رہتے، غیر ضروری کُتب اور علوم کو حذف کرتے رہتے اس طرح یہ نظام ترقی کرتا اور موجودہ عہد کی ضروریات کو بھی پورا کرتا۔

پھر یہ بھی ہے کہ اس سے قبل ان مدارس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ vocational training بھی دی جاتی تھی مثلاً اس نصاب میں طب کی تعلیم بھی شامل تھی۔ آہستہ آہستہ یہ روایت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔

اب حالت یہ ہے کہ زمانہ ایک طرف جارہا ہے تو یہ مدارس کا نظام دوسری طرف۔ یہ نظام نشو ونما، ترقی اور تبدیلی سے یکسر محروم ہے۔

طلبہ کا معاشرتی پسِ منظر

اس سے قبل اسلامی حکومتیں ان مدارس کی سرپرستی کرتی تھیں اور انہیں مالی وسائل مہیا کرنے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اب یہ مدارس محض انفرادی خیراتوں پر چل رہے ہیں، اس لیے معاشرے کے صاحب ثروت لوگ اپنے بچوں کو یہاں نہیں بھیجتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے کا سب سے نچلا طبقہ جو وسائل کی کمی کے باعث اپنے بچوں کو اسکولوں اور کالجوں میں نہیں بھیج سکتا، انہیں دینی مدارس میں بھیج دیتا ہے۔ خود طالب علم بھی اپنی اس مجبوری سے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی کا تلچھٹ ان مدارس کے حصے میں آتا ہے...... یہ معاشی اور معاشرتی پس منظر طلبہ اور اساتذہ میں احساسِ کمتری کو پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں یہ لوگ معاشرے میں کوئی اہم اور مؤثر رول ادا نہیں کر سکتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مدارس کے فارغ التحصیل افراد کی ذہنی سطح Medocrity سے آگے نہیں جاتی۔

دینی مدارس کا ماحول

دینی مدارس کے بارے میں یہ جو تاثر پایا جاتا ہے کہ طلبہ میں دینی جذبہ پروان چڑھایا جاتا ہے تو یہ بھی بتدریج کم ہوتا جارہا ہے۔ عربی، دینی مدارس کے طلبہ کی عام دینی اور اخلاقی حالت معاشرے کے دوسرے لوگوں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوتی۔ بداخلاقی اور بدکرداری کے واقعات عام ہوتے جارہے ہیں۔ اس میں کچھ دخل تو مدارس کے

مدارسِ عربیہ اسلامیہ دراصل اس بنیاد پر قائم ہیں کہ بعض علوم خالص دینی ہیں اور بعض خالص دُنیوی ہیں۔ اور ان میں کوئی تعلق باہمی نہیں ہے۔ اگر اس مفروضے کو درست مان لیا جائے تو پھر وہی صورتِ حال پیدا ہوگی جو ان دنوں مسلم معاشرے میں پیدا ہو چکی ہے۔

داخلی نظام اور ماحول کو ہے، کچھ طلبہ واساتذہ کے معاشی اور معاشرتی پس منظر سے ہے اور کچھ دخل نصابی کُتب کو بھی ہے۔ مثلاً عربی ادب کے نصاب میں ''نفحتہ الیمن'' نام کی جو کتاب طلبہ کو ابتدائی سالوں میں پڑھائی جاتی ہے وُہ بے ہودہ، فحش اور بے کار افسانوں اور قصوں پر مشتمل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ عمر کے اس حصے میں طلبہ اس طرح کی کتابیں پڑھیں گے تو وہ کس طرح کا اخلاق سیکھیں گے۔

تبدیلی کے تجربات

ندوہ میں اس نصاب تعلیم میں حذف واضافے اور تبدیلی کا بہت عمدہ تجربہ کیا گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ندوہ کی یہ روایت پاکستان میں منتقل نہ ہوسکی۔ پاکستان بننے کے بعد جماعتِ اسلامی نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اس ضمن میں کچھ تجربات کیے تھے۔ ملتان میں جامع العلوم کا قیام اور سندھ میں منصورہ کا قیام اس سلسلے کی اہم کڑیاں تھیں۔ منصورہ کا تجربہ بالخصوص کامیاب رہا۔ نہ صرف یہ کہ منصورہ میں نصاب تعلیم قدیم اسلامی علوم اور جدید علوم کا بہترین امتزاج تھا بلکہ جو اساتذہ رکھے گئے وہ بھی قدیم وجدید دونوں طرح کے علوم کے جامع تھے۔ لیکن اب ان مدارس کو حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور ان کی منفرد حیثیت کو ختم کر کے انہیں عام تعلیم کے نظام میں ضم کر دیا گیا ہے۔ ان دو اداروں کے علاوہ بھی جماعت اسلامی کے افراد متعدد شہروں میں

اگر علماء معاشرے میں علمی اور عملی رہنما کی حیثیت سے کوئی مؤثر رول ادا کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں جدید علوم سے واقفیت پیدا کرنی ہوگی۔

ایسے اسکول اور کالج چلا رہے تھے جہاں عام تعلیمی نصاب کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے، لیکن یہ اسکول اور کالج بھی اب حکومت کی تحویل میں چلے گئے ہیں۔

مدارس عربیہ کی بنیاد

مدارسِ عربیہ اسلامیہ دراصل اس بنیاد پر قائم ہیں کہ بعض علوم خالص دینی ہیں اور بعض خالص دُنیوی ہیں۔ اور ان میں کوئی تعلق باہمی نہیں ہے۔ اگر اس مفروضے کو درست مان لیا جائے تو پھر وہی صورتِ حال پیدا ہوگی جو ان دنوں مسلم معاشرے میں پیدا ہو چکی ہے..... یعنی ان دو مختلف نظامہائے تعلیم سے فارغ ہونے والے افراد ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہیں گے، آپس میں بات نہیں کر سکیں گے اور دونوں کے مابین ایک مسلسل کشمکش جاری رہے گی، اس طرح معاشرے میں ہم آہنگی اور وحدت کبھی بھی پیدا نہ ہو سکے گی۔

تبدیلی کی صورت

علماء کو جو بات پیش نظر رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ بھی اس معاشرہ کے فرد ہیں، اُنہیں بھی اسی معاشرے میں رہنا، ملنا جُلنا اور اٹھنا بیٹھنا ہے، ایسی صورت میں وہ اپنے معاشرے کے مسائل سے کیسے بے گانہ رہ سکتے ہیں؟ اُنہیں اپنے معاشرے کے مسائل کو سمجھنا ہوگا، اُس صورت حال اور اُن عوامل کو سمجھنا ہوگا جن کے نتیجے میں یہ مسائل پیدا ہوئے ہیں.....اور ان سب چیزوں کو اپنے نصاب میں داخل کرنا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ کوئی اسلامی انقلابی یا سماجی تبدیلی ان مدارس کے راستے نہیں آ سکتی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاشرے میں اپنا فعال اور مؤثر رول کھو چکے ہیں اور اب محض ایک روایت کو لے کر چل رہے ہیں جو دراصل جمود کی روایت ہے۔

اس کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دینی مدارس میں اوّلیں اہمیت تو دینی علوم کو دی جائے لیکن عام جدید علوم بھی ثانوی حیثیت سے پڑھائے جائیں۔دوسری طرف عام تعلیمی اداروں، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور فنی تعلیم کے اداروں میں اوّلیت تو اُن علوم کو دی جائے جن میں کوئی طالب علم تخصیص حاصل کررہا ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی مبادیات بھی اُسے پڑھادی جائیں۔

اگر علماء معاشرے میں علمی اور عملی رہنما کی حیثیت سے کوئی مؤثر رول ادا کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں جدید علوم سے واقفیت پیدا کرنی ہوگی۔اگر وہ جدید علوم سے اسی طرح بے گانہ رہے جس طرح کہ آج ہیں تو بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ وہ دینی کام بھی نہیں کرسکیں گے......سوائے نماز، جنازہ اور نکاح پڑھانے کے۔

جو علماء درسِ نظامی میں تبدیلی کے مخالف ہیں اور جدید علوم عمرانیات کو غیر دینی علوم قرار دے کر یہ کہتے ہیں کہ ان کے شامل کرنے سے دینی اداروں کے تقدس پر حرف آئے گا، اُن سے میرا سوال یہ ہے کہ پھر درسِ نظامی میں پہلے سے یہ غیر دینی علوم کیوں شامل ہیں؟ اگر پہلے سے غیر دینی علوم شامل ہیں تو اب نئے ''غیر دینی'' علوم کیوں شامل نہیں کیے جاسکتے؟ اگر دینی مدارس میں فارسی اور اردو پڑھائی جاسکتی ہیں...... جو اسلامی زبانیں ہرگز نہیں ہیں...... تو سوال یہ ہے کہ انگریزی بھی کیوں نہیں پڑھائی جاسکتی؟

پھر ان مدارس میں جو عربی پڑھائی جاتی ہے وہ بھی قدیم عربی ہے۔ عربی مدارس کے طلبہ جدید عربی سے یکسر نابلد رہتے ہیں...... بلکہ قدیم عربی سے بھی...... یہ طلبہ نہ عربی لکھ سکتے ہیں ہیں، نہ بول سکتے ہیں۔

مدارس اور سماجی تبدیلی

میرا خیال ہے کہ کوئی اسلامی انقلابی یا سماجی تبدیلی ان مدارس کے راستے نہیں آ سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاشرے میں اپنا فعال اور مؤثر رول کھو چکے ہیں اور اب محض ایک روایت کو لے کر چل رہے ہیں جو دراصل جمود کی روایت ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ یہ مدارس بتدریج تعلیمی معیار اور اخلاقی معیار کے اعتبارات سے مسلسل انحطاط اور تنزل کا شکار ہیں۔ طلبہ کا علمی اور اخلاقی معیار مسلسل گرتا جا رہا ہے۔

مدارس اور فرقہ بندی

ان مدارس کا ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ ان میں اصولیات اور کلیات پر اور اُن امور پر جن پر جمہور علمائے اہل سنت کا اتفاق ہے، کم توجہ دی جاتی ہے اور فروعی اور اختلافی مسائل پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ ان مسائل پر تقاریر کے لیے باقاعدہ مناظرہ بازی کی تربیت دی جاتی ہے۔ پھر یہ طلبہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب امام یا خطیب بنتے ہیں تو منبر پر کھڑے ہو کر مخالفین کے خلاف زہر اُگلتے ہیں اور معاشرے میں اختلاف اور فساد کے بیج بوتے ہیں۔ مسجدیں بھی اسی سے پہچانی جاتی ہیں کہ یہ بریلوی مسجد ہے، یہ دیوبندی ہے اور یہ اہلِ حدیثوں کی ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ علمی سطح پر تو ان فروعی اور اختلافی مسائل پر گفتگو کی گنجائش موجود ہے لیکن پبلک پلیٹ فارم سے ان مسائل کو چھیڑنا، عامۃ الناس کو ان بحثوں میں شامل کر کے اُن کو فریق بنانا اور ان کی تائید وحمایت سے باقاعدہ فرقے بنانا، امت میں انتشار کا باعث بن رہا ہے۔ اس چیز کو میں عوام کے دینی جذبات کا استحصال کرنا سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں جماعت اسلامی کے دفتر میں جب کبھی متحدہ محاذ کا یا کل جماعتی اجلاس ہوتا ہے اور نماز کا وقت آ جاتا ہے تو میں نے دیکھا ہے کہ عام سیاست دان تو سب کے ساتھ مل کر باجماعت نماز پڑھ لیتے

آپ کے محض کہنے سے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوسکتا۔ معاشرہ میں آئے دن جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں، وہ خود بخود اجتہاد کی ضرورت اور گنجائش پیدا کرتی رہتی ہیں۔

ہیں لیکن یہ علماء کرام اس ڈر سے بھاگ جاتے ہیں کہ کہیں اُنہیں ایسے شخص کے پیچھے نماز نہ پڑھنی پڑ جائے جس کا تعلق کسی دوسرے مسلک سے ہے۔ ان میں سے اکثر علماء دوسرے مسلک کے حامل افراد کے پیچھے نماز پڑھنے کو حرام قرار دے چکے ہوتے ہیں۔

اجتہاد کی گنجائش

یہ بات درست نہیں ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے..... کم از کم قرآن وسنت سے تو اس بات کی کوئی سند نہیں ملتی۔ اگر علماء کے نزدیک اس وقت کوئی ایسا موجود نہیں ہے جو اجتہاد کی ساری شرائط پوری کر سکے تو ممکن ہے مستقبل میں ایسا کوئی آدمی پیدا ہو جائے، دروازہ تو اس کے لیے کھلا رکھنا ہی چاہیے۔

آپ نے ''حافظے'' کی جس شرط کا ذکر کیا ہے، وہ لازمی اس وجہ سے نہیں ہے کہ اب جدید طریق تحقیق میں Indexing کا جو نظام رائج ہے اور احکام القرآن اور سنت کے جو Indexes تیار ہو چکے ہیں، اُن کی موجودگی میں یہ شرط ضروری نہیں رہتی۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ آپ کے محض کہنے سے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوسکتا۔ معاشرہ میں آئے دن جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں، وہ خود بخود اجتہاد کی ضرورت اور گنجائش پیدا کرتی رہتی ہیں۔

دوسرے سیاسی، معاشی، صنعتی، زرعی اور سماجی مسائل کو تو چھوڑیئے صرف نماز کے مسائل ہی کو لیجئے جس کے بارے میں علماء کہتے ہیں کہ اس سے متعلق تمام مسائل طے ہو چکے ہیں۔ نماز سے متعلق مسائل میں بھی کئی نئے مسائل ایسے حال میں سامنے آئے ہیں جنہوں نے اجتہاد کی ضرورت کو واضح کیا ہے اور علماء کرام نے اجتہادات کیے ہیں...... مثلاً یہ کہ ٹیکہ لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں، نائیلون کی جرابیں پہنی ہوں تو پاؤں دھونا ضروری ہے یا نہیں، خطبے اور نماز پڑھانے کے دوران لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا جواز...... یہ سارے مسائل ہیں جن پر ہمارے علماء نے رائے دی ہے مگر لطیفہ کی بات یہ ہے کہ علماء مانتے نہیں کہ وہ اجتہاد کر رہے ہیں۔

اسی طرح آج حکومت اگر زکوٰۃ وصول کرنے کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لے تو بہت سے کاروباروں کے متعلق اجتہاد کر کے طے کرنا ہوگا کہ ان پر زکوٰۃ ہوگی یا نہیں؟ مثلاً کرائے پر کراکری دینے والوں کا کاروبار، یہ تو ایک سادہ سی مثال ہے، جدید معاشی زندگی نے کاروباروں کی متعدد نئی اور پیچیدہ صورتیں پیدا کی ہیں، جن کے بارے میں قدیم فقہی سرمائے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اب اِن سب امور پر اجتہاد تو لازماً کرنا ہوگا۔

لیکن یہ بات بھی ہے کہ مادر پدر اجتہاد بھی درست نہیں ہے۔ خود علامہ اقبال جو دورِ جدید میں اجتہاد کی ضرورت کے سب سے بڑے علمبردار تھے، وہ بھی اجتہاد میں احتیاط کے قائل ہیں۔

مفتی
محمد حسین نعیمی

مہتمم جامعہ نعیمیہ، لاہور

۲۳۔ اپریل ۱۹۷۵ء

جامعه نعیمیه کے بانی مفتی محمد حسین نعیمی ۲ مارچ ۱۹۲۳ء کوھندوستان میں ضلع مراد آباد کے قریبی قصبہ سنبھل میں پیدا ھوئے۔آپکے والد محترم ملا تفضل حسین مرحوم نے ۱۹۳۳ء میں آپکو مبلغ اسلام بنانے کی غرض سے مراد آباد کی دینی درسگاہ جامعہ نعیمیہ میں داخل کرا دیا۔ وھاں آپ صدرالافاضل مولانانعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمة کے زیر سایہ مختلف اساتذہ سے اکتساب فیض کرتے رھے۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا شمس الحق بھاری ،مفتی امین الدین نعیمی ،مولانا وصی احمد، مولانا محمد یونس نعیمی اور مولانا محمد عمر نعیمی شامل ھیں۔ قیامِ پاکستان کی جدوجھد میں اپنے استاذ صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی کی قیادت میں عملاً شریک ھوئے۔۱۹۴۱ء میں آپ جامعہ نعیمیہ سے فارغ ھوئے اور لاھور تشریف لائے۔ یھاں آپ عظیم درسگاہ دارالعلوم حزب الا حناف میں درس نظامی کے استاد مقرر ھوئے۔ جھاں ۱۹۴۸ء تک آپ طلباء کو دینی تعلیم دیتے رھے۔ ۱۹۴۸ء میں لاھور کی ایک اور دینی درسگاہ جامعہ نعمانیہ میں آپکا بطور مدرس تقرر ھوا۔جھاں آپ عرصہ پانچ سال تک طلباء کو درس نظامی کی تعلیم دیتے رھے۔ ۱۹۴۳ء میں جامع مسجد چوک دالگراں میں آپکا بطور خطیب تقرر ھوا۔ ۱۹۵۳ء میں اسی جامع مسجد میں آپ نے دارالعلوم جامعہ نعیمیہ کے نام سے ایک باضابطہ دارالعلوم کی بنیاد رکھی اور ۱۹۶۰ء میں اس دارالعلوم کو عید گاہ

گڑھی شاھو میں منتقل کر دیا۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مفتی صاحب نے بالترتیب فاضل عربی اور فاضل فارسی کیا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریك ختم نبوت میں بھی مفتی صاحب سر گرم مجاھد تھے۔ چوك دالگراں کی جامع مسجدمیں ایك تند و تیز تقریر کی بناء پر آپکو گرفتار کر کے بورسٹل جیل لاھور میں رکھا گیا۔ فوجی عدالت میں مقدمہ چلا مگر پولیس کی طرف سے پیش کر دہ گوا ہ متضاد بیانات کی وجہ سے جھوٹے ثابت ھوئے اور آپکو بری کر دیا گیا۔ اسی تحریك میں آپکو ایك بار پھر قید کر کے شاھی قلعہ لاھور میں رکھا گیا ۔ ۱۹۶۱ء میں محکمہ اوقاف قائم ھوا اور جامع مسجد دالگراں بھی اوقاف میں آگئی ۱۹۶۲ء میں محکمہ اوقاف کی طرف سے آپکو ضلعی خطیب مقرر کیا گیا۔ چار سال تك آپ نے اسی منصب پر کام کیا۔ ایك بارپھر صدر ایوب کے دور میں ۲۹ جنوری ۱۹۶۷ء کو آپ عید کے چاند کے مسئلہ کی بنا پر مچھ جیل بلوچستان میں قید کر دیئے گئے۔ صدر جنرل محمد ضیاا لحق کے دور میں ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تك مفتی صاحب اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر رھے۔ اور ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تك صدر محمد ضیاء الحق کی مجلس شوری کے رکن رھے ۔ ۱۹۹۱ء میں مرکزی رویت ھلال کمیٹی کے چیئرمین مقرر ھوئے۔ علاوہ ازیں شیعہ سنی امن کمیٹی اور محکمہ اوقاف کے انٹرویو بورڈ کے رکن رھے۔ اسلامی یونیورسٹی اسلا م آباد کے بورڈ آف دعوت وارشاد کے ممبرر ھے ۔ آپ نے کئی بیرونی ممالك کے تبلیغی دورے بھی کئے ۔ جن میں چین ، سعودی عرب ، ایرا ن ا ور تھائی لینڈ شامل ھیں ۔آپ نے ۱۲ مارچ ۱۹۹۸ء صبح تین بجے داعی اجل کو لبیك کھا۔آپ کا مرقد انور جامعہ نعیمیہ میں ھی ھے۔

دینی تعلیم کا مقصد اور ضرورت

ہر مسلمان پر یہ دینی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کا علم حاصل کرے جن کا ماخذ قرآن و سنت ہیں۔ درسِ نظامی پر مشتمل دینی مدارس کے نظام کا محور بھی قرآن اور حدیث پر عبور اور مہارت حاصل کرنا ہے۔ درسِ نظامی میں جو بارہ مضامین یا علوم بحیثیت معاون علوم پڑھائے جاتے ہیں اُن کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان کی مدد سے کتاب وسنت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

میرے خیال میں کتاب وسنت کو براہِ راست سمجھنے کا واحد ذریعہ درسِ نظامی ہے۔ ہمارے ملک میں کوئی دوسرا نصاب ایسا نہیں ہے جس سے قرآن اور حدیث کی تعلیم ہو سکے۔ اس وقت اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں وغیرہ کے نصاب میں اسلام کی سطحی معلومات...... اور وہ بھی جزوی طور پر..... شامل کی گئی ہیں جو کسی طرح بھی دینی ضرورت کو پورا نہیں کرتیں۔ یہ اسلام کا بے حد محدود مطالعہ ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان معاشرے کو اور اس معاشرے میں اسلامی آئین کو بروئے کار لانے کے لیے درسِ نظامی کی تعلیم وتدریس واحد ذریعہ رہ گئی ہے۔

درس نظامی میں تبدیلی کی ضرورت

درسِ نظامی کے نصاب میں اگر کچھ ترمیم کر دی جائے تو یہ زیادہ مؤثر اور مفید ہو سکتا ہے لیکن ترمیم اس نوعیت کی ہو کہ جو اصل دینی علوم ہیں مثلاً قرآن، حدیث، فقہ اور اصول فقہ وغیرہ، یہ قائم رکھے جائیں اور باقی معاون علوم میں کمی یا بیشی کر دی جائے۔ اس تبدیلی میں کتابوں کی تبدیلی بھی شامل ہے۔ عصر حاضر کے جدید علوم اور معاشرتی زندگی پر مشتمل مضامین بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔

لیکن ان تبدیلیوں کے لیے حسب ذیل شرائط لازمی ہیں:

۱۔ تمام مدارس کی ایک باقاعدہ تنظیم قائم کی جائے جو مدارس کے نظم ونسق، نصاب، طریقِ امتحان وغیرہ میں ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کرے۔

جب تک حکومت کے پاس دین دار اور فرض شناس عملہ نہ ہو، اس وقت تک دینی مدارس کے معاملات میں مداخلت کرنے کا اُسے کوئی حق نہیں۔

۲۔ جدید وقدیم ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک بورڈ درسِ نظامی کے نصاب پر نظرِ ثانی کرے اور اس میں مناسب تبدیلیاں تجویز کرے۔

۳۔ پھر اس نئے نصاب کو کامیاب کرنے کے لیے حکومت ان مدارس کی سرپرستی کرے اور نئے نصاب کی ترویج کے لیے جن ذرائع وسائل کی ضرورت ہو وہ حکومت مہیا کرے۔

[میرے اس سوال پر کہ کیا اس طرح آپ حکومت کو دینی مدارس کے نظام میں مداخلت کا موقع فراہم نہیں کریں گے؟] مولانا نے فرمایا:

اگر حکومت درسِ نظامی کے مقصد کو سمجھتی ہو اور اسے اس کی اہمیت کا احساس ہو اور حکومت کو اپنے دینی فریضے کی ادائیگی کا جذبہ ہو تو ایسی حکومت کی مداخلت کو نہ صرف یہ کہ ہم برداشت کرلیں گے بلکہ اس کی مداخلت کا خیر مقدم کریں گے۔ لیکن بے دین اور بے عمل نوکر شاہی کی مداخلت دینی مدارس کی تباہی کا باعث ہوگی۔ چنانچہ میرا مؤقف اس سلسلے میں یہی ہے کہ جب تک حکومت کے پاس دیندار اور فرض شناس عملہ نہ ہو، اس وقت تک دینی مدارس کے معاملات میں مداخلت کرنے کا اُسے کوئی حق نہیں۔

نصاب کی تبدیلی صرف اُس وقت مؤثر اور کامیاب ہوگی جب سارے مدارس مل کر یہ کام کریں گے۔ کوئی ایک مدرسہ اکیلا یہ کام کرے گا تو کامیاب نہیں ہوگا۔ حکومت نے جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں ترمیم کے

درسِ نظامی عالم پیدا نہیں کرتا اور نہ ہی اس کا یہ مقصد ہے۔ درسِ نظامی اپنے فارغ التحصیل طلبہ میں دینی علوم کو سمجھنے کی استعداد پیدا کرتا ہے اور انہیں ان علوم میں مزید مطالعہ وتحقیق کے لیے تیار کرتا ہے۔

ساتھ درسِ نظامی کو چلانا چاہا لیکن یہ تجربہ کامیاب نہیں ہوا۔

نصاب تعلیم کی تبدیلی کو کامیاب کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حکومت تبدیل شدہ نصاب کا اعلان کرے اور کہے کہ جو مدارس اس تبدیل شدہ نصاب کے مطابق تعلیم دیں گے اُن کی سندیں عام تعلیمی ڈگریوں کے برابر تسلیم کی جائیں گی۔ یہ ایک طرح سے ترغیب ہوگی اور مدارس اپنے اپنے ہاں نصاب میں تبدیلی کرنا شروع کردیں گے۔

اس وقت مدارسِ عربیہ کے ساتھ ایک مشکل ہورہی ہے کہ طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد مدرسے بدلتی رہتی ہے..... آج یہاں، کل وہاں..... یا تو ابتداء ہی سے طلبہ ایک ہی مدرسے میں رہیں اور وہیں سے فارغ التحصیل ہوں۔ ایسی صورت میں ایک متعین نصاب کی مکمل تعلیم کامیابی کے ساتھ دی جاسکتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر مدارس کے منتظمین کی بہت بڑی تعداد اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ نصاب میں تبدیلی ہونی چاہیے لیکن ان میں سے کوئی بھی پہل کرنے کو تیار نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مدرسہ بھی درسِ نظامی میں

بنیادی تبدیلیوں کی پہل کرے گا وہ ایک طرح سے single out ہوجائے گا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اس طرح کی کوشش اجتماعی طور پر ہونی چاہیے۔

[میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا نصاب تعلیم میں تبدیلی کے ضمن میں اُن کے پیشِ نظر جدید علوم عمرانیات کو شامل کرنا بھی ہے، مولانا نے فرمایا]

جدید علوم عمرانیات کو قدیم اسلامی علوم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن وسنت ہی علوم عمرانی کے ماخذ رہیں اور قرآن وسنت اور فقہ کی تعلیم کے دوران ہی عمرانی مسائل پر بحث کی جاسکتی ہے اور طلبہ کو ان سے متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح عام اخلاقی تعلیمات بھی قرآن وسنت کی تدریس کے دوران دی جاسکتی ہیں۔ البتہ جو نئی چیزیں درسِ نظامی کے ساتھ شامل کرنے کی ضرورت ہے وہ ہیں، بنیادی سائنس کی معلومات، جغرافیہ، تاریخ، حساب، انشاپردازی کی مشق وغیرہ۔

تدریس کا موجودہ طریقہ

موجودہ طریقہ تو یہ ہے کہ ابتدائی پانچ سالوں میں معاون علوم پڑھائے جاتے ہیں اور قرآن اور حدیث آخری دو سالوں میں۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ ابتدائی سالوں میں قرآن وسنت کو سمجھنے کی استعداد پیدا کی جاتی ہے۔ قرآن چونکہ سارے علوم کا منبع ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس پر تدبر کرنے کے لیے اور اس کے مطالب و معانی کو سمجھنے کے لیے، طلبہ میں اس کی استعداد پیدا کی جائے۔

دیوبندی اور بریلوی مدارس نصاب میں یکسانیت

ہمارا اور دیوبندی حضرات کا اختلاف بعض دینی مسائل پر ہے لیکن دونوں اپنے اپنے مؤقف کے لیے دلائل قرآن وسنت ہی سے لاتے ہیں۔ لہٰذا دونوں کا نصاب مشترک ہے۔ درسِ نظامی کا نصاب دونوں طرح کے مدارس میں ایک ہی ہے۔ دونوں کے مسلک کا اختلاف نصابی کُتب کی وجہ سے نہیں بلکہ اساتذہ کی تعلیم سے آگے بڑھتا ہے۔

طلبہ میں علمی شوق

درسِ نظامی عالم پیدا نہیں کرتا اور نہ ہی اس کا یہ مقصد ہے۔ درسِ نظامی اپنے فارغ التحصیل طلبہ میں دینی علوم کو سمجھنے کی استعداد پیدا کرتا ہے اور انہیں ان علوم میں مزید مطالعہ وتحقیق کے لیے تیار کرتا ہے۔ درسِ نظامی دراصل تیاری کا مرحلہ ہے جس کے بعد طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مزید مطالعہ کر کے ہر علم وفن میں تحقیق کر سکیں۔

اب بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے مدارس کے فارغ التحصیل حضرات کو درسِ نظامی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نہ تو فراغت ملتی ہے اور نہ ہی انہیں مناسب وسائل مہیا ہوتے ہیں۔ معاشی کفالت کے لیے انہیں تعلیم کے فوراً بعد کوئی نہ کوئی ملازمت اختیار کرنا پڑتی ہے اور ملازمت کے دوران اُسے فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ مطالعہ وتحقیق کا کام کر سکے۔ چنانچہ تمام مال خام مال ہی رہتا ہے۔

[میرے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کا اس تاثر کے بارے میں کیا خیال ہے کہ بالعموم مدارسِ عربیہ کے طلبہ میں آزادانہ تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتیں پروان نہیں چڑھتیں اور وہ تقلیدِ محض کے ہو کر رہ جاتے ہیں، مولانا نے فرمایا]

اگر تقلید سے مراد اساتذہ کی تقلید ہے تو واقعی یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔ طلبہ کو اساتذہ سے اختلاف کرنے کا حق ہے اور انہیں یہ حق استعمال کرنا چاہیے۔ انہیں اس بات کی پوری آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی تحقیق اور اپنی اختلافی رائے کو بیان کر سکیں لیکن کتاب وسنت کے مفہوم اور مطالب جو سلف صالحین اور متقدمین سے تواتر کے ساتھ نقل ہوئے ہیں، اُن سے اختلاف کرنا اور اُن سے باہر سوچنا، درست نہیں ہے اور اس بات کی آزادی نہیں ہونی چاہیے۔

مدارس کا معیار تعلیم

جس طرح اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بارے میں یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ ان میں معیارِ تعلیم گر رہا ہے۔ اسی طرح دینی مدارس میں بھی طلبہ کا معیار استعداد انحطاط پذیر ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے بے شمار مدارس قائم ہوتے جا رہے ہیں جو تعلیم کا معیار برقرار نہیں رکھ سکتے۔ جس طرح آج سے چند سال پہلے ہر میٹرک اور ایف اے پاس جسے ملازمت نہیں ملتی تھی اپنا الگ اسکول اور کالج کھول کر خود ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل بن جاتا تھا۔ اسی طرح دینی مدارس بھی جگہ جگہ کھل رہے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا مدرسہ بھی اپنے آپ کو ''مرکزی دارالعلوم'' کہلوا رہا ہے۔ معیارِ تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مدارس کی درجہ بندی کر دی جائے۔

[مولانا نے بتایا کہ اس وقت جامعہ نعیمیہ میں طلبہ کی کل تعداد 150 ہے اور ان میں درسِ نظامی کے طلبہ کی تعداد 125 ہے۔ اس وقت مدرسہ میں ایک طالب علم ملائیشیاء اور ایک جنوبی افریقہ کا ہے۔ باقی طلبہ میں سے اکثریت صوبہ سرحد اور پنجاب میں ملتان ڈویژن کے طلبہ کی ہے۔ اساتذہ کی تعداد 8 ہے اور سب اساتذہ جامعہ نعیمیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔]

جاوید احمد غامدی

”الاشراق“۔لاہور

۱۷۔اپریل ۱۹۷۵ء

جاوید احمد غامدی ۱۸ اپریل ۱۹۵۱ کو ضلع ساھیوال (پنجاب) کے ایک کاشت کار گھرانے میں پیدا ھوئے۔ آپ کے والد گرامی برصغیر کی ایک معروف صوفی روایت سے وابستہ تھے۔ گویا غامدی صاحب نے جس گھریلو ماحول میں ابتدائی پرورش پائی وہ صوفی روایت کے زیر اثر تھا۔ وھی صوفی روایت جس کو آگے چل کر غامدی صاحب نے اپنی تحریرو تقریر میں شدید علمی تنقید کا نشانہ بنایا۔ آپ نے میٹرک تک کی تعلیم ایک مقامی سکول سے حاصل کی۔ آپ کو بچپن ھی سے کتابیں پڑھنے کا اس قدر شوق تھا کہ دسویں جماعت میں سکول کے ھیڈماسٹر نے آپ کا ذوق مطالعہ دیکھ کر کلاس میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا اور سکول کے اندر آپ کی رھائش کا اھتمام کیا تاکہ سکول آنے جانے میں جو وقت صرف ھوتا ھے وہ بھی آپ کتب بینی کو دے سکیں۔ ساتویں جماعت میں سکول کے ایک استاد نے مولانا مودودی کے لٹریچر سے متعارف کروایا۔ غامدی صاحب کے بقول اس تعارف نے ان پر علم و عمل کے نئے در وا کردیے۔ دسویں جماعت تک آپ نے روایتی طریقہ تدریس کے مطابق ایک مقامی عالم سے درس نظامی کی تمام چیدہ چیدہ کتابیں پڑھ چکے تھے۔ ۱۹۶۷ میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ لاھور شہر منتقل ھوئے اور گورنمنٹ کالج لاھور سے انگریزی ادب میں بی اے آنرز کیا۔ یھاں بھی آپ کا بے انتھا ذوق مطالعہ کالج اور یونیورسٹی کے قیدوبند سے موافق

نہیں ہوسکا اور رسمی تعلیم کو خیرباد کہتے ہوئے ذاتی طور پرکتب بینی کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ وہ دور تھا جب آپ مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے زیراثر دین کے سیاسی غلبے اور اسلامی ریاست کے قیام کو زندگی کا مقصد سمجھتے تھے اور اس کام میں دوسرے احباب کے ساتھ پوری طرح مصروف عمل تھے۔ ۱۹۷۳ءمیں آپ کا تعارف برصغیر کے ممتاز مفسر اور عالم دین مولانا حمیدالدین فراہی کے علمی کام سے ہوا اور ان کے کام کے ذریعے سے آپ مولانا امین احسن اصلاحی تک پہنچے۔ مولانا اصلاحی نے نہ صرف یہ کہ آپ کے سوچنے کے اندازکو متاثر کیا بلکہ ان پر دین پر غور وفکر کے نئے زاویے کھول دیے۔ مولانا اصلاحی کا تعلق برصغیر کی اس علمی روایت سے تھا جس نے قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر میں نظم کا اصول اپنایا ہے۔ مولانا اصلاحی سے دین سیکھنے کا یہ سلسلہ کم وبیش دس سال تک جاری رہا۔ مولانا فراہی و اصلاحی کے دین پر غور وفکر کے اصول سیکھنے کے بعد غامدی صاحب کو ایک فکری کشمکش اور اضطراب کے دور سے گزرنا پڑا۔ مولانا فراہی و اصلاحی کی فکر نے ان کو کسی مخصوص فقہی مسلک کی پیروی کرنے اور اس کا دفاع کرنے کی بجائے براہ راست قرآن وسنت سے استفادہ کرنے کا حوصلہ دیا۔ اب ان کے خیال میں فقہ، کلام، تصوف اور قانون کے ضمن میں کوئی بات تمی طور پر صرف اس وقت تسلیم کی جائے گی جب اس کی بنیاد قرآن وسنت پر رکھی گئی ہو اور قرآن وسنت پر غور وفکر کا جو طریقہ کار انھوں نے اپنایا اس کی بنیاد فکر فراہی و اصلاحی پر تھی۔

جاوید احمد غامدی نے کئی برس تک سول سروسز اکیڈمی لاہور میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ "المورد" (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سائنسز) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے میں کئی جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلامی علوم پڑھانے کے بعد ریسرچ فیلوز کی حیثیت سے رکھا گیا۔ پاکستان میں اسلامی تعلیم کے ضمن میں غامدی صاحب جس طرح کی اصلاح چاہتے ہیں، یہ ادارہ ان کی فکر کی گویا

نمائندگی کرتا ھے۔ اس ادارے کے زیر اھتمام دو جریدے، ایك اردو ماھنامه "اشراق"اور ایك انگریزی ماھنامه "رینی ساں " (Renaissance) باقاعدگی سے شائع ھورھے ھیں۔ ان دونوں علمی جرائد میں اسلام کے سماجی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی پهلووں کے حوالے سے جاوید غامدی اور ان کے شاگردوں کی تحقیقات شائع کی جاتی ھیں۔

غامدی صاحب اور ان کی فکر کو پاکستان میں بڑے پیمانے پرمتعارف ھونے کا سنهری موقع اس وقت ملا جب سابقه صدر جنرل مشرف کے دور میں نجی ٹی وی چینلزکو کام کرنے کا موقع ملا۔ کئی نجی چینلز نے مذھبی اور سماجی موضوعات پر نسبتا زیادہ آزادی سے ٹاك شوز کروانے شروع کئے۔ ان پروگراموں میں نه صرف یه که غامدی صاحب کو ایك وسیع پیمانے پر متعارف ھونے کا موقع ملا بلکه جهاد و قتال، حدود وتعزیرات اور خواتین اور غیرمسلموں کے حقوق کے حوالے سے ان کی آراء کو کچھ سماجی حلقوں میں پذیرائی بھی ملی۔

جاوید غامدی کئی کتابوں کے مصنف ھیں جن میں۔"البیان" (قرآن کا نظم کلام کی رعایت سے ترجمه)، "میزان" (اسلام کا تعارف)، "برھان" (معاصر مذھبی فکر پر تنقید) اور "مقامات" (ان کی خودنوشت) شامل ھیں۔ ان کے علاوہ، جاوید صاحب شعروشاعری اور ادب کا نهایت اچھا ذوق رکھتے ھیں جو ان کے شعری مجموعے "خیال و خامه" میں نظر آتا ھے۔ ان کے شعر وسخن پر علامه اقبال کی شاعری اور اسلوب بیان کی نهایت گهری چھاپ نظر آتی ھے۔

جس دور میں ۱۹۷۵ میں جاوید احمد غامدی سے یه انٹرویو لیا جارھا تھا تب وہ مولانا مودودی کے فریضه اقامت دین کو ھی دین کی صحیح تعبیر و تشریح سمجھتے تھے۔ لیکن جیسے که ذکر ھوچکا ھے که بعد میں دین کے مختلف پهلووں کے حوالے سے ان کی آراء میں مسلسل ارتقا کا عمل جاری رھا جو ان کی تحریروں اور تقریروں میں دیکھی جاسکتی ھیں۔

ہمارے ہاں سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ہمارے ہاں دو نظام ہائے تعلیم ایک دوسرے سے الگ تھلگ موجود رہے ہیں۔ جہاں تک دینی مدارس کا تعلق ہے تو ان میں صرف غریب طبقے کے لوگ، جنھیں کوئی اور معاشی صورت نہ نظر آتی تھی، آنے لگے۔ جو لوگ جدید نظامِ تعلیم کی طرف گئے وہ بھی تقلیدی ذہنیت کے حامل تھے اور وہ اپنے اندر کوئی تنقیدی اور تخلیقی صلاحیت پیدا نہیں کر سکے۔ خود جماعت اسلامی کے اندر بھی لوگ قدیم اور جدید میں بٹے ہوئے ہیں اور امتزاج کی وہ صورت ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی جو جماعت اسلامی کے پیش نظر تھی۔ جو لوگ مدارس کے فارغ التحصیل تھے وہ اُن لوگوں سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں جنھوں نے یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔

اندریں حالات میں نے سوچا کہ احیائے علوم اسلامیہ کے لیے ایک بھرپور کوشش کی جانی چاہیے۔ مجھے معلوم تھا کہ مغرب کی حالیہ ترقی دو سو سال کی مسلسل علمی ترقیوں کی مرہونِ منت تھی۔ دوسری طرف ہماری پس ماندگی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں گذشتہ آٹھ سو سال سے احیاءِ علومِ دینیہ کا کام بالکل نہیں ہوا۔ پھر انگریزوں کی آمد کے بعد ہمارے ہاں دو نظام ہائے تعلیم ساتھ ساتھ چلنے لگے تو نتیجہ یہ ہوا کہ زمامِ کار تو جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ہاتھ میں آ گئی اور مولوی بے چارہ پیچھے رہ گیا۔ مولوی حضرات کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ یہ اپنی مخصوص اصطلاحات میں بات کرتے تھے جو جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے ناقابلِ فہم تھیں، چنانچہ دونوں طبقوں کے درمیان ابلاغ تقریباً ناممکن ہو کر رہ گیا۔

اب اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے دو ہی طریقے ممکن تھے۔ ایک تو یہ کہ نظامِ حکومت ہمارے ہاتھ میں ہو اور ہم ایک اسلامی نظامِ تعلیم کی تشکیل کریں لیکن خود اقتدارِ حکومت کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ ہم نظامِ تعلیم میں تبدیلی لائیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ دینی مدارس کو تبدیلی پر آمادہ کیا جائے لیکن اس کام میں دو اہم مشکلات تھیں ایک تو یہ کہ مدارس کے نظامِ تعلیم میں تبدیلی کے لیے ضروری تھا کہ قدیم اور جدید علوم کے ماہر

ہماری پس ماندگی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں گذشتہ آٹھ سو سال سے احیاءِ علومِ دینیہ کا کام بالکل نہیں ہوا۔

اساتذہ اور علماء کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہو جو اس تبدیلی کو نافذ کر سکے، دوسری مشکل یہ تھی کہ مدارس کے لوگوں کا خیال تھا کہ جو مدرسہ بھی تبدیلی کی سمت پہل کرے گا اُس کا چندہ بند ہو جائے گا، اس لیے کہ مدارس کے لوگ جدید علوم کی شمولیت سے یہ سمجھیں گے کہ ان سے مدارس دینیہ کا تقدس مجروح ہو گیا ہے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ خود جماعتِ اسلامی کے اندر بھی ایسے لوگ موجود نہیں تھے جو یہ کام کر سکیں۔ چنانچہ ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے میں نے درمیانی راستہ نکالا اور اپنے طالب علم ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا۔ ابتداء میں رابطے کی صورت یہ تھی کہ گورنمنٹ کالج میں زمانۂ طالبعلمی کے دوران میں کچھ ساتھیوں کو جاوید نامہ پڑھاتا تھا اور درسِ قرآن دیتا تھا۔ ان میں سے جو نوجوان ساتھی مختلف اوقات میں میرے ساتھ رہے اور درس و تدریس کے اس سلسلے میں شامل رہے ان کی تعداد 35 تھی۔ میرے ذہن میں دراصل ایک ایسی اکیڈمی کا نقشہ تھا جو آگے چل کر کسی جامعہ کے لیے اساتذہ فراہم کر سکے۔ اس وقت میرے پاس یہ چھ نوجوان ساتھی ہیں جو اُن 35 ساتھیوں میں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ میرے پیشِ نظر یہ ہے کہ مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان ساتھیوں کے سیرت و کردار کی بھی تعمیر کی جائے۔ یہ سب ساتھی تحریکِ اسلامی سے بھی وابستہ ہوں، ذہین ہوں اور علمی مطالعے اور تحقیق کے صبر آزما تجربات سے گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی زندگیاں اس کام کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ تقریباً سب ساتھی مختلف

مولوی حضرات کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ یہ اپنی مخصوص اصطلاحات میں بات کرتے تھے جو جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے ناقابلِ فہم تھیں، چنانچہ دونوں طبقوں کے درمیان ابلاغ تقریباً ناممکن ہو کر رہ گیا۔

مضامین میں ایم اے ہیں۔

تعلیم و مطالعہ کا پروگرام یہ ہے کہ سب سے پہلے تو انہیں عربی کی تعلیم دی جارہی ہے۔ میں خود عربی پڑھا رہا ہوں، ابتداء عربی قواعد کی مبادیات سے کی گئی ہے اس کے ساتھ درسِ نظامی میں شامل عربی کُتب بھی پڑھائی جارہی ہیں مگر نئی ترتیب کے ساتھ۔

ہم نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ عربی زبان کے ساتھ دیگر علوم کا تعلق بھی استوار کیا جائے۔ چنانچہ اب چند ماہ بعد عربی ادب میں مقدمہ ابن خلدون پڑھایا جائے گا، پھر عربی جاہلی شاعری کے منتخب حصے پڑھائے جائیں گے۔ اس میں کوئی چھ سات ماہ لگ جائیں گے۔ اس کے بعد تفسیر کشاف کے ذریعے سورۂ فاتحہ پڑھاؤں گا اس کے ساتھ ہی قرآن پاک کی تمام اہم تفاسیر کا خلاصہ ان کے سامنے رکھوں گا۔ زمخشری، بیضاوی، جلالین اور ابن کثیر اس طرح انہیں پڑھائی جائیں گی کہ ان پر ان مصنفین کا علمی contribution تو عیاں ہو جائے لیکن یہ لوگ ان مصنفین کے رعب تلے دب نہ جائیں۔ ''اصولِ تفسیر'' پر کوئی نصابی کُتب پڑھانے کی بجائے میں خود اصولِ تفسیر پڑھاؤں گا۔ حدیث میں موطا امام مالک اور بخاری تو سبقاً سبقاً پڑھاؤں گا باقی کُتبِ حدیث کا مطالعہ یہ لوگ خود کر لیں گے۔

اس کے بعد فقہ کی باری آئے گی۔ میں اس سلسلے میں یہ تجربہ کرنا چاہتا ہوں کہ انہیں چاروں آئمہ کی فقہ

میں خود ''اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید'' کے موضوع پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس کام کے سامنے آنے کے بعد اس موضوع پر کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا۔

پڑھاؤں۔ فقہ کی تعلیم اس طریقے پر ہوگی کہ مسائل پر بحث ہوگی، کسی ایک خاص مسئلہ پر چاروں آئمہ کی رائے سامنے لائی جائے گی پھر اس پر بحث و تمحیص ہوگی۔ اس طرح میرے پیشِ نظر یہ بھی ہے کہ فقہ کی تدریس کے ساتھ ساتھ ہم سب ساتھی مل کر چاروں آئمہ کی فقہ پر ایک تنقیدی مطالعہ بھی مرتب کر لیں گے۔ دراصل ہم جو فقہ پڑھیں گے وہ نہ حنفی ہوگی، نہ حنبلی، نہ شافعی اور نہ مالکی...... یہ اسلامی فقہ ہوگی۔ فقہ کے بعد انہیں جدید فلسفہ اور جدید علمِ معاشیات پڑھاؤں گا۔ فلسفہ اور منطق میں قدیم اور جدید سبھی فلسفی شامل ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی علمِ نفسیات بھی پڑھایا جائے گا۔ یہ سارا کام اندازاً چار سال کا ہوگا۔ اس مطالعے کے بعد ہم مختلف موضوعات پر تحقیق و تصنیف کا کام کریں گے۔ اجتماعی کام صرف فقہ پر ہوگا، اس کے بعد ان لوگوں کی اپنی صوابدید پر منحصر ہوگا کہ وہ کس خاص شعبہ علم میں تخصیصی دلچسپی کے ساتھ تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت میرے پیشِ نظر یہ ہے کہ:

۱۔ پوری فقہ اسلامی پر نظر ثانی کی جائے

۲۔ اسلام کے معاشی قانون کو مرتب و مدون کیا جائے

۳۔ قانونِ اجتماعی کو شق وار جمع کیا جائے

۴۔ قرآن کے تصورِ تاریخ پر کام کیا جائے

مجھے مولانا مودودی کی تعبیر دین سے اتفاق ہے لیکن یہ تعبیرِ دین میں نے مولانا مودودی سے نہیں سیکھی بلکہ قرآن و حدیث کے آزادانہ مطالعہ سے براہِ راست حاصل کی ہے۔

۵۔ میں خود "اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید" کے موضوع پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس کام کے سامنے آنے کے بعد اس موضوع پر کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا۔

[میرے اس سوال کے جواب میں کہ مولانا مودودی صاحب نے دین کی جو تعبیر پیش کی ہے اور مختلف دینی مسائل پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، آپ اس سے کس حد تک متفق ہیں، جاوید صاحب نے کہا]

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر آنے والا نبی اپنے سے پہلے نبی کی تصدیق کرتا ہے۔ مجھے مولانا مودودی کی تعبیر دین سے اتفاق ہے لیکن یہ تعبیرِ دین میں نے مولانا مودودی سے نہیں سیکھی بلکہ قرآن وحدیث کے آزادانہ مطالعہ سے براہِ راست حاصل کی ہے۔ بعد میں مولانا مودودی کی تصنیفات پڑھیں تو معلوم ہوا کہ مولانا بھی دین تو اُسی طرح سمجھے ہیں جیسا کہ میں نے سمجھا ہے۔ پھر جب اُن میں بھی وہی بات دیکھی جو میں نے سمجھی تھی تو اُن کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن بعض مسائل پر مجھے مودودی صاحب سے اختلاف بھی ہے اگر چہ وہ بنیادی مسائل نہیں ہیں۔

[اجتہاد کے بارے میں میرے ایک سوال پر جاوید صاحب نے کہا]

اصل مسئلہ یہ ہے کہ جدید دور کے حالات کو کتاب وسنت کے مطابق ڈھالا جائے نہ کہ کتاب وسنت کو جدید دور کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ دنیا میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کا حل اسلام نے نہ دیا ہو۔

میں اکثر پڑھے لکھے سامعین کے سامنے تقریریں کرتا ہوں۔
آج تک میرے سامنے کوئی ایسا سوال نہیں کیا گیا جس کا
جواب میں قرآن وسنت کی روشنی میں نہ دے سکا ہوں۔

میں آپ کو اپنا تجربہ بتاتا ہوں۔ میں اکثر پڑھے لکھے سامعین کے سامنے تقریریں کرتا ہوں۔ آج تک میرے سامنے کوئی ایسا سوال نہیں کیا گیا جس کا جواب میں قرآن وسنت کی روشنی میں نہ دے سکا ہوں۔ میں بیسیوں اجتماعات سے خطاب کر چکا ہوں اور میں نے ہمیشہ پڑھے لکھے افراد کی اس بارے میں تشفی کر دی ہے کہ اسلام جدید دور کے تمام مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔

مولانا عبدالحق

بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ

اکوڑہ خٹک، پشاور

۶ - مئی ۱۹۷۵ء

دارالعلوم حقانیہ کے بانی شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۲ء کو اکوڑہ خٹك ضلع نوشہرہ میں حضرت مولانا حاجی معروف گل ولد الحاج میر آفتاب ولد عبدالحمید کے گھر پیدا ہوئے۔آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والدین اور گاؤں کے مشہور بزرگ حاجی صاحب قصابان اور ممتاز بزرگ مولانا عبدالقادر صاحب سے حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، وہاں درس نظامی کی تکمیل کی اور ۱۹۳۳ء میں سند فراغت حاصل کی۔آپ کے مشہور اساتذہ کرام میں مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ،مولانا اعزاز علی دیوبندیؒ، مولانا محمد ابراهیم بلیاویؒ اورمولانا عبدالسمیع دیوبندیؒ شامل ہیں۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے آبائی گاؤں اکوڑہ خٹك میں ۱۹۳۷ء میں اپنی ایك چھوٹی سی مسجد میں مختلف علوم و فنون کی چھوٹی بڑی کتابوں

کی تدریس شروع کی۔ انھی دنوں آپ نے انجمن تعلیم القرآن کے نام سے ایک اسلامی سکول کی بنیاد بھی رکھی جس کا سنگ بنیاد مولانا حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے رکھا۔ ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں پڑھانے لگے اور آپ کا شمار اکابر اساتذہ میں ہونے لگا۔دارالعلوم دیوبند سے آپ ۱۳۶۶ھ کو رمضان المبارک کی تعطیلات میں اکوڑہ خٹک تشریف لائے تو اسی دوران (۱۹۴۷ء میں) ہندوستان تقسیم ہو گیا تو ۱۹۴۷ء بمطابق ۱۳۶۶ھ کو دارالعلوم حقانیہ کی بنیاد رکھی۔ جس کو تبلیغی، تعلیمی اور دینی خدمات کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب رحمہ اللہ نے "دیوبند ثانی" کا خطاب دیا۔ آپ نے عارف باللہ، عظیم مجاھد حاجی صاحب ترنگزئی کے دستِ مبارک پر بیعت کی ان کے انتقال کے بعد آپ نے اپنے مشفق استاد حضرت مدنی سے بیعت کی اور سلوک کے جملہ مراحل طے کیے۔

آپ نے درس و تدریس کے ساتھ ملّی ، سیاسی اور سماجی خدمات میں بھی بھرپور کردار اداکیا۔ آپ نے بدعات اور رسومات کے خلاف حکیمانہ انداز میں کامیاب جہاد کیا، خاکسار تحریک اور قادیانیت کے خلاف اورتحفظ ناموسِ رسالت کے لیے دیگر علماء حق کے دوش بدوش کام کیا۔ ۱۹۵۲ء میں سابق وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے اسلامی قوانین کے سلسلے میں مشورے کے لیے جن آٹھ علماء کا انتخاب کیا تھا ان میں آپ بھی شامل تھے۔ ۱۹۵۲ء میں دیگر علمائے دیوبند کے ساتھ مل کر جمعیت علماء اسلام کی بنیاد رکھی۔اسی طرح ۱۹۶۹ء میں سوشلزم کے مسائل پر

اختلاف کے حل کے لیے جن علماء کا انتخاب ہوا تھا۔ آپ اس میں بھی سرِفہرست تھے اور ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں بھاری اکثریت سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور ایوان میں شریعت کے نفاذ کے لیے انتھک کوشش کی۔ آپ نے ۱۹۷۲ء کے آئین کے لیے مسلمان کی متفقہ تعریف کی۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں آپ نے تقریباً دو سو سے زائد ترمیمات پیش کیں۔ ۱۹۷۴ء میں تحریک ختم نبوت میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۷۷ء میں جب نظامِ مصطفی کی تحریک شروع ہوئی تو باوجود علالت اور پیرانہ سالی کے آپ نے اس میں دیگر علماء کے شانہ بشانہ کلم کیا۔۱۹۸۰ء کی دھائی میں افغانستان پر سوویت یونین کے حملے کے بعد افغانستان کی تحریکِ آزادی میں مجاھدین کی معاونت میں نہایت اھم رول ادا کیا۔ افغان جہاد میں حصّہ لینے والے اور بعد ازاں طالبان رھنمائوں میں سے اکثر مولانا عبدالحق صاحب کے شاگرد تھے۔ ۱۹۸۵ء میں شریعت محاذ آپ کی دعوت پر عمل میں آیا اس کے ذریعے دیوبندی ،بریلوی، اھل حدیث، جماعت اسلامی اور دیگر دینی جماعتیں اکٹھی ھوئیں اور قومی اسمبلی میں شریعت بل منظوری کے لیے پیش کیا۔ ۱۹۸۶ء میں ھزارہ ڈویژن، بنوں ڈویژن، پشاور، مردان کے ھزاروں علماء و مشائخ نے آپ کو متفقہ طور پر قائد شریعت کا خطاب کیادیا۔آپ کا انتقال ۷ستمبر ۱۹۹۸ء میں خیبر ٹیچنگ ھسپتال پشاور میں ھوا۔

دینی مدارس کا نصاب تعلیم

دینی مدارس کا نظامِ تعلیم دراصل دینیات کی تعلیم کا نظام ہے۔ اس نظامِ تعلیم میں شریعت کی تعلیم دی جاتی ہے.....شریعت جو کامل اور مکمل ہے۔ اس میں عبادات، معاملات، معاشرتی امور، سیاسیات، معاشیات، نکاح وطلاق کے مسائل، رعیت اور حاکم کے حقوق وفرائض، بیع وتجارت اور مضاربت، میراث ووصیت کے مسائل غرض زندگی کا ہر پہلو اور ہر مسئلہ شامل ہے۔

یہ نظامِ تعلیم جس مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اسلامی احکامات اور قوانین کی تعلیم کو باقی اور جاری رکھا جائے۔ اسی لیے قرآن، حدیث اور فقہ کے علوم اس نظامِ تعلیم میں بنیادی حیثیت سے شامل کیے گئے۔ پھر قرآن اور حدیث سے احکامات اور قوانین مستنبط کرنے کے اصول وضع ہوئے اور اس عمل نے باقاعدہ علم کی صورت اختیار کی تو اسے ''اصولِ فقہ'' کے نام پر اس نظامِ تعلیم میں رائج کیا گیا۔ بعد میں جب دورِ عباسیہ میں یونانی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا تو اس فلسفے کے مختلف مسائل کو الٰہیات، طبعیات، منطق اور عنصریات کے عنوانات سے اس نظامِ تعلیم میں شامل کر لیا گیا لیکن فلسفۂ یونان کے منفرد پہلو اسلامی عقائد سے متصادم اور متناقص تھے، چنانچہ علماء اسلام نے ان پہلوؤں کا ابطال کیا اور ان کے تنقیدی مطالعہ کو علم کلام کی صورت میں دینی تعلیم میں شامل کر لیا گیا۔ فلسفہ اور منطق کی کتابیں کم وبیش اسی دور میں نصابِ تعلیم میں شامل کی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ ایسے فلسفیانہ نظریات کا تنقیدی مطالعہ کر کے ان کا ابطال کیا جائے جو اسلامی تعلیمات سے متعلق شکوک وشبہات پیدا کر سکتے تھے۔ علم کلام کی تشکیل اسی مقصد کو سامنے رکھ کر کی گئی۔

علاوہ ازیں چونکہ قرآن اور حدیث کو سمجھنے کے لیے عربی زبان، اس کے محاورات اور کمالات سے واقفیت ضروری تھی، اسی لیے عربی گرائمر.....صرف ونحو.....کی تشکیل ہوئی۔ پھر قرآن کی فصاحت وبلاغت کو سمجھنے کے لیے، جو اپنی مثال آپ تھی، علمِ بیان ومعانی کی تشکیل ہوئی تاکہ قرآن کی فصاحت وبلاغت کے لطیف پہلوؤں

موجودہ دینی مدارس کا نصب العین صرف یہی ہے کہ دینی تعلیمات کا تحفظ کیا جائے، اس سے زیادہ ان مدارس کی بساط نہیں ہے۔

کا ذوق پیدا ہو سکے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عربی گرائمر اور علمِ بیاں و معانی کا مطالعہ بجائے خود کوئی مقصد نہ تھا بلکہ ان علوم کی تعلیم کو قرآن و حدیث ہی کی تفہیم کے لیے شامل کیا گیا تھا۔

دینی مدارس کی تعلیم کا مقصد

اس تعلیم کا بنیادی مقصد دین کا تحفظ اور اس کی اشاعت تھا۔ موجودہ دینی مدارس کا نصاب العین بھی صرف یہی ہے کہ دینی تعلیمات کا تحفظ کیا جائے، اس سے زیادہ ان مدارس کی بساط نہیں ہے۔ اصل کام جو موجودہ حالات میں ہمارے کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ جو دین بزرگوں سے ہم تک پہنچا ہے، وہی محفوظ رہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کچھ اور کرنے کے لیے نہ ہمارے پاس وسائل ہیں اور نہ فنڈز۔ کوئی فعال نصب العین مدارس دینیہ اُس وقت اپنے سامنے رکھیں گے جب حکومت بھی تعاون کرے گی اور اس کارِ خیر میں حصہ لے گی لیکن حکومت کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اِس اعتماد کا اہل اور قابل ہی ثابت نہیں کرتی کہ وہ اس کام میں کوئی حصہ لے سکے۔

مدارس دینیہ کی تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت

میرے نزدیک اپنے مقصد اور نصب العین کے اعتبار سے اس نظامِ تعلیم میں کوئی ایسی کمی نہیں ہے جسے دور کرنے کے لیے اس میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نظام نے اب تک جتنے افراد پیدا کیے ہیں، وہ علم و دانش کے لحاظ سے قابل لوگ تھے۔ اگر اس نظامِ تعلیم میں کوئی کمی ہوتی تو یہ علماء اور فضلاء کیسے پیدا ہوتے؟ سبھی علماء و فقہاء اسی نظامِ تعلیم سے پڑھ کر نکلے ہیں۔

میرے نزدیک اپنے مقصد اور نصب العین کے اعتبار سے اس نظامِ تعلیم میں کوئی ایسی کمی نہیں ہے جسے دور کرنے کے لیے اس میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔

جہاں تک اس نظامِ تعلیم میں ترمیم وتبدیلی کا سوال ہے، تو شریعت کی کلیات میں تو کسی بھی ترمیم و تنسیخ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم قرآن وحدیث کے کسی حصے کو تو حذف نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے تو امکان صرف اُسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب ہم خدانخواستہ اسلام ہی کو چھوڑ دیں۔ صاف بات ہے کہ اگر کوئی شخص آج یہ کہتا ہے کہ موجودہ دور میں سود کی حُرمت اور پانچ وقت کی نماز چلنے والی چیزیں نہیں ہیں، اور یہ کہ نماز پڑھنے سے دفتروں اور کارخانوں کے کام میں حرج ہوگا، تو ہم ان دلائل کی بنا پر نہ تو سود کو جائز قرار دے دیں گے اور نہ ہی نماز کو ساقط کر دیں گے۔ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

البتہ جہاں تک مدارسِ دینیہ میں پڑھائے جانے والے دیگر علوم کا تعلق ہے مثلاً فلسفہ، منطق اور کلام وغیرہ تو ان میں تبدیلی اور ترمیم و تنسیخ کی گنجائش موجود ہے لیکن اس کی جو صورت ہمارے لیے قابلِ قبول ہوگی وہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام کی تمام حکومتوں کی سرپرستی میں جدید علوم کے چیدہ چیدہ ماہرین پر مشتمل ایک بورڈ قائم کیا جائے۔ یہ بورڈ جدید علوم فلسفہ، منطق، کلام اور علوم عمرانیات کا ایک خلاصہ تیار کرے۔ پھر دنیائے اسلام کے منتخب علماء مل کر ان جدید علوم کے اُن پہلوؤں کا ابطال تیار کریں جو قرآن وسنت کی تعلیمات سے متصادم ہوں، اس طرح جو مجموعے مرتب ہوں اُنہیں دینی مدارس کے نصاب میں شامل کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور کو خاص طور پر سامنے رکھا جائے۔

اگر حکومت دینی مدارس میں مداخلت کرنا چاہتی ہے تو اُسے چاہیے کہ پہلے اپنے حُسن نیت کا اعتبار اور ثبوت بہم پہنچائے۔۔۔۔۔۔ اگر اسے اصلاح کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نظامِ تعلیم کی اصلاح کا کام کیوں نہیں کرتی؟۔

۱۔ تبدیل شدہ نصاب کو صرف اُسی صورت میں درسِ نظامی میں شامل کیا جائے گا جب اس کے لیے اجتماعی کوشش کی جائے گی۔ بے شک انفرادی سطح پر ہمارے ہاں بہت قیمتی کوششیں ہوئی ہیں اور سوشلزم، سرمایہ داری اور اشتراکیت کی رد میں جو کتابیں اور رسائل لکھے گئے ہیں، ان سے ہمارے نوجوان طبقے نے استفادہ بھی کیا ہے، تاہم یہ ساری کوششیں چونکہ انفرادی تھیں اس لیے انہیں مدارسِ دینیہ کے نظامِ تعلیم میں شامل نہیں کیا جاسکا۔

۲۔ یہ کام صرف اسلامی حکومتوں کی سرپرستی ہی میں ہوسکتا ہے۔

۳۔ تبدیل شدہ نصاب کے مجموعے مرتب کرتے وقت یہ بات پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ مخالفین اسلام کے اقوال ونظریات ہی کو جمع کر کے نہ پڑھایا جائے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث اور عقل کی روشنی میں ان کی رد اور ابطال بھی طلبہ کو پڑھایا جائے۔

۴۔ اس کام میں جدید علوم کے ماہرین اور علوم اسلامیہ کے ماہرین کا باہمی تعاون بے حد ضروری ہے۔

۵۔ تبدیل شدہ نصاب کے مجموعے عربی زبان میں مرتب کیے جائیں۔

علومِ عمرانیات کا شامل ہونا بہت ضروری ہے۔ ہم خود چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے اور وسائل مہیا

عالمِ اسلام کے مسائل، جدید دور کے حالات و کوائف اور معاشرتی اور اقتصادی امور بھی زیرِ بحث لائے جائیں تا کہ طلبہ میں دورِ جدید کے مسائل کا فہم اور شعور پیدا ہو سکے۔

فرمائے تو ہم اپنے مدرسے میں علوم عمرانیات کو شامل کر لیں لیکن اصل مسئلہ وسائل اور اساتذہ کا ہے۔

اس سلسلے میں خود طلبہ کا روّیہ بھی سامنے رکھنا چاہیے، طلبہ بھی نئے علوم نہیں پڑھنا چاہتے۔ وہ لکیر کے فقیر ہیں اور صرف پرانی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ طلبہ جب چاہتے ہیں ایک مدرسہ چھوڑ کر دوسرے مدرسے میں چلے جاتے ہیں۔

حکومت کی مداخلت

اگر حکومت دینی مدارس میں مداخلت کرنا چاہتی ہے تو اُسے چاہیے کہ پہلے اپنے حُسن نیت کا اعتبار اور ثبوت بہم پہنچائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اسے اصلاح کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نظامِ تعلیم کی اصلاح کا کام کیوں نہیں کرتی؟ اس سے اُسے کون روک رہا ہے؟

دینی مدارس کے نظامِ تعلیم نے گذشتہ بارہ سو سال سے اسلام کو باقی رکھا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اب اگر اس کو بھی بدل دیا جائے جبکہ اس کی جگہ لینے کے لیے کوئی دوسرا نظام بھی موجود نہیں ہے تو کیا اس سے خطرناک نتائج پیدا نہ ہوں گے؟

درس نظامی میں قرآن و حدیث کا مطالعہ

آپ دیکھیں گے کہ مدارسِ دینیہ میں معاون علوم پانچ یا چھ سال میں پڑھائے جاتے ہیں۔ آخری دو سالوں میں قرآن و

یہ جو ہمارے اکابر نے کہا ہے کہ اجتہاد کا سلسلہ بند ہو
چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب انفرادی رائے
نہیں دی جائے گی۔

حدیث کی تعلیم دی جاتی ہے۔ فلسفے کی بڑی اور غیر ضروری کتابیں حذف کر دی گئی ہیں۔ ہم بھی منطق اور فلسفہ کے حصے کو کم کر رہے ہیں لیکن فلسفہ و منطق کو بالکل ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کی عدم موجودگی سے طلبہ کی علمی اور ذہنی صلاحیتوں میں ضعف پیدا ہونے کا امکان ہے۔

طریقِ تعلیم اور دورِ جدید کے مسائل

آپ کی یہ رائے درست ہے کہ حدیث کی تعلیم کے دوران اکثر مدارس میں اصولی مسائل پر کم اور فروعی، اختلافی مسائل پر بحث زیادہ ہوتی ہے۔ آج سے چھ سو برس پہلے کا جو دور گزرا ہے اُس میں متعدد اختلافی بحثیں چھڑی ہوئی تھیں۔ ان اختلافی بحثوں کا اثر مدارس کی تعلیم پر بھی پڑا ہے۔ مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ قرآن و حدیث کی تعلیم کے دوران اساتذہ کو موجودہ دور کے مسائل کو زیرِ بحث لانا چاہیے۔ جب تک کہ مذکورہ بالا تجویز کے مطابق کوئی مستقل نصاب نظریات باطلہ کی رد کے لیے رائج نہیں ہوتا اُس وقت تک نظامِ تعلیم میں فروعی اختلافی مسائل سے توجہ ہٹا کر اصولی مسائل پر توجہ کی جائے۔ عالمِ اسلام کے مسائل، جدید دور کے حالات و کوائف اور معاشرتی اور اقتصادی امور بھی زیرِ بحث لائے جائیں تا کہ طلبہ میں دورِ جدید کے مسائل کا فہم اور شعور پیدا ہو سکے۔

دراصل درسِ نظامی کا مقصد ہی یہی ہے کہ طلبہ میں مطالعے کی ابتداء کرا دی جائے اور اُن میں مطالعہ و تحقیق کا ذوق پیدا کر دیا جائے۔ درسِ نظامی سے فارغ ہونے والا طالب علم عالم نہیں ہو جاتا جس طرح منطق پر دو تین

درسِ نظامی سے فارغ ہونے والا طالب علم عالم نہیں ہو جاتا جس طرح منطق پر دو تین کتابیں پڑھ کر کوئی شخص منطقی نہیں بن جاتا۔

کتابیں پڑھ کر کوئی شخص منطقی نہیں بن جاتا۔ درسِ نظامی تو طلبہ میں اس بات کی استعداد پیدا کرتا ہے کہ وہ مزید مطالعہ و تحقیق کے قابل ہوسکیں۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ طلبہ میں مطالعے کے ذوق کی کمی ہے اور مطالعے سے گھبراتے ہیں۔

مدارس دینیہ میں پیشہ ورانہ تربیت

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس تعلیم کا مقصد معاش کمانا ہے ہی نہیں۔ ہمارے ہاں تصور یہ ہے کہ دین کو سیکھیں، اس پر عمل کریں اور اس کی اشاعت کریں نہ یہ کہ اس سے معاش کمانے کی کوشش کریں۔

تاہم آپ کی یہ بات درست ہے کہ موجودہ دور میں پیشہ ورانہ تربیت کی بھی ضرورت ہے۔ دراصل پرانے زمانے میں توکل اور قناعت بہت تھی۔ علماء مساجد اور مدارس میں بغیر معاوضہ یا تنخواہ لیے، دین کی خدمت کرتے تھے، جوار کی سوکھی روٹی پر بھی خوش تھے۔ اب اس دور میں یہ جذبہ ناپید ہو رہا ہے۔ اب ضروری ہے کہ مدارسِ دینیہ کے طلبہ کو کچھ ایسے فنون سکھا دیے جائیں جن سے وہ آزادانہ طور پر اپنی روزی کما سکیں۔ ان فنون میں طب، خوشنویسی، درزی کا کام، جوتوں کی سلائی کا کام وغیرہ شامل کیے جاسکتے ہیں۔

اس سلسلے میں میرا عملی تجربہ یہ رہا ہے کہ جن لوگوں نے کوئی اور کام سیکھا ہے وہ پھر اُسی کام کے ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کے اسکولوں اور کالجوں میں عربی اور اسلامیات پڑھانے پر بھی جو لوگ مامور ہوئے ہیں، اُن کا عالم

یہ ہے کہ اپنی تین تین چار چار سو روپے کی تنخواہوں میں مگن ہو کر دین کو بھول چکے ہیں۔

اسکولوں، کالجوں میں دینی تعلیم

حکومتی نظام کے تحت جو تعلیمی ادارے چل رہے ہیں اُن میں صدقِ دل سے دین کی خدمت نہیں ہو رہی۔ ظاہر ہے کہ تین چار سورتوں کو یاد کر کے یا اُن کا ترجمہ پڑھ کر دینی تعلیم کے سارے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے اس کے لیے علوم اسلامیہ سے کلّی آگاہی ضروری ہے۔ کالجوں میں زیادہ سے زیادہ بچوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور یہ کہ نماز وغیرہ کیسے پڑھی جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسلام کی بنیاد پر امریکہ، روس اور چین کے باطل نظریات کا مقابلہ کر سکیں تو اس کے لیے یہ بات کافی نہیں ہوگی، اس لیے کہ علوم اسلامیہ کا گہرا مطالعہ کرنا ہوگا۔

اجتہاد کی ضرورت، گنجائش

اجتہاد کا مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اگر اجتہاد کی کھلی اجازت دے دی جائے تو پھر آپ کو ہر گلی اور ہر محلے میں دس دس بیس بیس مجتہد ملیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی احکام و شریعت کے متعلق تصادم و انتشار کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہ جو ہمارے اکابر نے کہا ہے کہ اجتہاد کا سلسلہ بند ہو چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب انفرادی رائے نہیں دی جائے گی۔

اب جو مسائل پہلے زمانے میں پیش آ چکے ہیں اور قرآن و حدیث میں ان کے متعلق فیصلہ دیا جا چکا ہے تو ان میں اجتہاد کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، اُنہیں کسی قاعدہ اور اصول کے تحت حل کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اجتہاد کی شرائط کو کما حقہٗ پورا کر کے ان مسائل پر اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ بہتر صورت یہ ہوگی کہ چیدہ چیدہ علماء مل کر بیٹھیں اور زیرِ بحث مسئلہ کے مالہ وماعلیہ پر غور کر کے کسی متفقہ فیصلے پر پہنچیں۔ اس اجتماعی کوشش میں یقیناً اللہ تعالیٰ کی خوشنودی شامل ہوگی۔

مولانا
محمد ایوب جان بنوری

مہتمم دارالعلوم سرحد، پشاور

۷ - مئی ۱۹۷۵ء

مولانا محمد ایوب جان بنوری کا خاندان پشاورکے علاقہ بھانہ ماڑی میں مقیم تھا۔ مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم ان کے کزن تھے جن کے والد مولانا محمد زکریا بنوری بھی یہیں قیام فرما رہے۔ مولانا محمد ایوب جان مرحوم بنوری خاندان کے ممتاز افراد میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ شیخ الحدیث مولانا عبدالحئی کے معاصر اور قریبی احباب میں سے تھے۔ دارالعلوم سرحد کے نام سے ایك وقیع تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ جمعیت علماء اسلام سے وابستہ تھے اور تاحیات اس کے صوبائی صدر رہے۔

درس نظامی میں تبدیلی

اس وقت ہما ے مدرسہ میں جونصاب پڑھایا جاتا ہے وہ وہی ہے جو دارالعلوم دیوبند میں رائج ہے۔ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس نصاب میں دو چیزوں کا اضافہ ضروری ہے۔ایک تاریخ اور دوسرے جغرافیہ۔

فلسفہ، منطق، کلام

دراصل ہمارے نصاب کی غائت یہ ہے کہ علومِ عربیہ پر عبور حاصل ہو اور علومِ عربیہ کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے جہاں تک منطق کا تعلق ہے تو اس کی کُتب کا باقی رہنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس سے طلبہ کی استعداد بڑھتی ہے۔ ان کُتب میں کوئی کمی نہیں کرنی چاہیے۔فلسفہ بھی ضروری ہے لیکن محض اصطلاحات سے واقفیت کے لیے پڑھایا جائے تو بھی مناسب ہے۔ پرانے فلسفے کی ایک کتاب پڑھانا ضروری ہے تاکہ طلبہ کو قدیم فلسفے کی اصطلاحات سے بھی واقفیت ہو جائے۔ جہاں تک جدید فلسفہ اور علم کلام کا تعلق ہے تو اس دور میں جو جدید فرقے سامنے آئے ہیں اور جو دین کے خلاف ہیں، مثلاً پرویزیت وغیرہ، تو ان کے اعتراضات اور ان کے جوابات بھی نئے علم کلام کی صورت میں مدوّن کیے جائیں اور انہیں نصاب میں شامل کیا جائے۔ نئے باطل فرقوں کے ابطال پر کُتب کا رائج کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ہم خود ایسا کرنا چاہتے ہیں لیکن سرمائے کی کمی کی وجہ سے نہیں کر سکے۔

علوم عمرانیات

[علوم عمرانیات کے شامل کرنے پر میرے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے کہا]

علوم عمرانیات کی تحصیل تو عام مطالعے سے بھی ہو سکتی ہے۔ضروری نہیں کہ انہیں نصاب میں شامل کیا جائے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر مدرس کامل ہو تو قرآن وحدیث پڑھاتے وقت علوم ومسائل عمرانی پر بھی روشنی ڈال سکتا ہے۔ مدرسین کو چاہیے کہ وہ قرآن وحدیث پڑھاتے وقت طلبہ کو جدید مسائل سے بھی آگاہ کرتے رہیں اور ساتھ ہی قرآن وحدیث کی روشنی میں ان مسائل کا حل پیش کریں۔ مدرسین ان موضوعات پر الگ سے تقریریں بھی کر

> ہمارا نصاب طلبہ کو عالم بنانے کے لیے نہیں ہے۔ ہم تو دراصل علم کی راہ دکھاتے ہیں اگر کسی کو عالم بننا ہے تو وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے طور پر مطالعہ جاری رکھے۔

سکتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ علوم عمرانیات کو مستقل مضامین کی حیثیت سے پڑھایا جائے یا ان علوم کی کُتب نصاب میں شامل کی جائیں۔

درسِ نظامی کی غایت اور مقاصد

ہمارا نصاب طلبہ کو عالم بنانے کے لیے نہیں ہے۔ ہم تو دراصل علم کی راہ دکھاتے ہیں اگر کسی کو عالم بننا ہے تو وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے طور پر مطالعہ جاری رکھے۔ ہمارے نصاب میں علوم آلیہ پر زور بھی اسی وجہ سے دیا جاتا ہے کہ طلبہ میں استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جائے اور وہ علوم مقصودہ میں آگے بڑھتے رہیں۔

اس نصاب تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ علمِ دین حاصل ہو جائے دُنیوی علوم کا حصول نہیں۔ حکومت نے کئی بار پیش کش کی ہے کہ اگر ہم مدارس میں انگریزی پڑھانا شروع کریں تو وہ مدارس کو امداد دیں گے لیکن اس کے لیے جو طریقہ حکومت تجویز کرتی ہے وہ درست نہیں ہے۔ درست طریقہ یہ ہے کہ یا تو ہمارے ہاں کے فارغ التحصیل طلبہ اپنی دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کریں یا دوسری صورت یہ ہے کہ انگریزی اسکولوں سے میٹرک وغیرہ کرنے کے بعد طلبہ ہمارے پاس آئیں اور علوم دینی و عربی پڑھیں۔ ان کے لیے دو تین سال کا ایک الگ نصاب مرتب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن

مخالف ہوں کہ جدید تعلیم اور دینی مدارس کی تعلیم کو اکٹھا کر دیا جائے۔ اگر دین کے ساتھ دنیا کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر دین نہیں رہے گا، دُنیا ہی دُنیا رہے گی۔

ہم نے جدید علوم کے ساتھ بھی وہی نفرت برتی جو ہم انگریزوں
کے ساتھ برت رہے تھے حالانکہ یہ علوم انگریزوں کی ملکیت نہ
تھے بلکہ ان کی حیثیت عالمی تھی۔

طریق تعلیم

[جدید طریقِ تعلیم سے متعلق میرے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا]

جدید طریقِ تعلیم کے ذرائع بھی اختیار کیے جاسکتے ہیں اور آپ کی بات درست ہے کہ کتاب کے بجائے علوم و فنون کی تفہیم پر زور دینا چاہیے۔ خود میرا طریقہ تدریس یہی ہے کہ میں کسی فن کی کتاب شروع کرنے سے پہلے اس فن کے مقاصد سے طلبہ کو آگاہ کرتا ہوں۔

ہمارے ہاں طلبہ سوالات بھی کرتے ہیں، اساتذہ سے بحث بھی کرتے ہیں۔ عقائد میں تو بالخصوص متعدد اختلافی مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ اساتذہ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ طلبہ کی پورے طور پر تشفی کردی جائے۔ اس کے ساتھ ہی طلبہ کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ان مسائل پر اور دیگر تمام مسائل پر سلف صالحین کا مسلک صحیح اور درست ہے۔ ہم ماڈرن اسلام نہیں چاہتے کہ طلبہ کو یہ بتائیں نہ انبیاء معصوم ہیں اور نہ ہی صحابہ معیارِ حق ہیں یا یہ کہ سود اور شراب حلال ہیں۔ حالانکہ صحابہؓ تو پیغمبرؐ کے اولیں شاگرد تھے اور اگر ان کو معیارِ حق نہ کہیں تو پھر تو دین دین ہی نہیں رہتا۔

اجتہاد

ایک تو وہ مسائل ہیں کہ جن کا فیصلہ آئمہ کرام نے کردیا ہے۔ اب آئمہ تابعین تھے یا تبع تابعین تھے، اُن کا زمانہ ہمارے زمانے سے بدرجہا اچھا تھا لہٰذا جو مسائل اُنہوں نے حل کیے ہیں، اُن میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ باقی رہے نئے مسائل تو ان پر اجتہاد کیا جاسکتا ہے مثلاً ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر وغیرہ نئی چیزیں بنیں، آئمہ کے دور میں نہیں تھیں، لہٰذا ان کے بارے میں اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ بڑے بڑے علماء

اصل بات یہ ہے کہ ہمیں سلف صالحین سے منقول چیزوں پر کاربند رہنا چاہیے، اِدھراُدھر دیکھنے میں خطرات بہت ہیں۔

اکٹھے ہو کر ان مسائل پر غور کریں اور صحابہؓ اور سلف صالحین کے اقوال کی روشنی میں اجتہاد کریں۔ انفرادی اجتہاد کو کوئی نہ مانے گا، اور نہ ماننے کی یہ چیز ہے۔ مثلاً مفقود الخبر خاوند کے مسئلہ پر دیوبند میں اجماع کے ذریعے علمائے دیوبند اور علمائے سہارنپور نے فقۂ مالکی کے مسلک کو اختیار کر لیا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ ہمیں سلف صالحین سے منقول چیزوں پر کاربند رہنا چاہیے، اِدھراُدھر دیکھنے میں خطرات بہت ہیں۔

اساتذہ

ہمارے ہاں اساتذہ کی اہمیت بھی اسی وجہ سے ہے کہ ان کا علم سلف صالحین سے منقول ہوتا ہے۔ علم وہی اچھا ہے جو کسی عالم سے پڑھا جائے۔ فضل الرحمان کی طرح کسی یہودی سے نہیں۔ پھر تو گمراہی ہو گی۔ استاد کا صحیح ہونا اوّلیں شرط ہے۔

مولانا
محمد ناظم ندوی

سابق شیخ الجامعہ
جامعہ اسلامیہ بہاولپور

کراچی،۲۰ - جون ۱۹۷۵ء

مولانا محمد ناظم ندوی جن کا شمار ملک کے صف اول کے علماء میں ھوتا تھا، ۱۹۱۴ء میں بھار شریف میں پیدا ھوئے اور ۲۰۰۰ء میں کراچی سپرد خاک ھوئے۔

۱۹۱۴ء سے ۲۰۰۰ء کا زمانہ علم کے حصول اور تدریس کی ایک بھر پور اور طویل داستان ھے ،خوب سے خوب تر کی تلاش میں ندوہ پیونچے،وھاں مولوی اور فاضل کا کورس مکمل کیا اور وھیں تدریس سے وابستہ ھوگئے اور ترقی کرتے کرتے ندوۃ العلماء کے پرنسپل بن گئے۔

قیام پاکستان کے بعد نوزائیدہ مملکت کی لگن اُن کو کراچی کھینچ لائی۔ کچھ عرصہ کراچی میں قیام کے بعد آپ جامعہ عباسیہ بھاولپور کے شیخ الجامعہ مقرر ھوئے اور عرصہ دراز تک اس حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رھے۔

ندوہ کے زمانے میں مولانا ناظم ندوی علامہ سید سلیمان ندوی کے خاص شاگردوں میں شمارھوتے تھے۔ ندوہ میں اُس زمانے میں تین افراد عربی لغت اور انشاء کے ماھر سمجھے جاتے تھے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا محمد ناظم ندوی ان سب کو علامہ سید سلمان ندوی کی تربیت اور خاص توجہ حاصل رھی اور ان میں سے ھر ایک کا نام علم کی دنیا میں خوب روشن رھا۔ سیدؒ

صاحب مرحوم نے اپنی کتاب " خطبات مدارس" کا اردو سے عربی میں ترجمه کا کام مولانا ظم ندوی کے سُپرد کیا جسے قاهره کے ایك معتبر پبلشر نے شائع کیا۔
مولانا محمد ناظم ندوی ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۴ء میں جامعه اسلامیه مدینه منوره کی دعوت پر ایك سال تك تدریس کے فرائض انجام دیتے رهے۔
ان کی تالیفات میں سب سے قابلِ ذکر ان کا شعری مجموعه عربی زبان "باقة الا زهار" کے نام سے شائع هوا۔ برصغیر میں دینی تعلیم کی روایت پر آپ کی گهری نظر تهی جس کا اندازه ان کے انٹرویو سے کیا جا سکتا هے۔

ہمارے ہاں دو طرح کے دینی مدارس پائے جاتے ہیں۔ایک تو وہ مدارس جہاں قدیم دینی اور عربی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے یعنی منطق، فلسفہ، عربی صرف ونحو، بلاغت، معانی، فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، کلام وغیرہ۔نوے فیصد یا اس سے بھی زائد مدارس یہی نصاب پڑھا رہے ہیں..... اور صدیوں سے پڑھا رہے ہیں۔ البتہ ان نصابی مضامین سے متعلق کُتب میں بعض اوقات تبدیلی ہوتی رہی ہے لیکن یہ تغیرّ بھی تیزی کے ساتھ نہیں ہوا۔مثلاً محبّ اللہ بہاری کی کتابیں مسلم العلوم اور مسلم الثبوت اور اول الذکر کی متعدد شرحیں نصاب میں داخل کی گئیں۔اب محبّ اللہ بہاری کا انتقال ۱۱۱۱ھ میں ہوا ہے..... یعنی کوئی پونے تین سو برس قبل۔ یہ کتابیں اب تک نصاب میں داخل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں نہایت ادق، مشکل اور اختصار نویسی کا شاہکار ہیں۔ مجھے محبّ اللہ بہاری جیسے عظیم عالم، فلسفی اور اصولی کے علم اور عظمت کا پورا پورا اعتراف ہے تاہم میں یہ بات کہنے کی جرأت کروں گا کہ یہ کتابیں محض چیستاں اور معمّہ ہیں۔لیکن ستم یہ ہے کہ یہ کتابیں اب تک دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہیں اور ہم اپنے تاریخی جمود کی وجہ سے ان پر کوئی اضافہ نہیں کر سکے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ عرصہ دراز سے علوم دینی کی کتابوں کی تعداد دوسرے علوم کے مقابلے میں 1/3 ہے اور طالب علم کا زیادہ تر وقت منطق، فلسفہ، صرف ونحو، معانی و بلاغت وغیرہ میں صرف ہو جاتا ہے۔ ہندو پاکستان میں چند ایک مدارس ایسے بھی قائم ہوئے ہیں جہاں جدید علوم کی تھوڑی سی مقدار بھی داخل کی گئی ہے اور میٹرک تک کے مضامین داخل نصاب ہیں..... یعنی تاریخ، جغرافیہ، حساب، معلوماتِ عامہ، شہریت اور انگریزی وغیرہ۔

ہمارا وہ قدیم نصاب جو عرصہ دراز سے رائج چلا آ رہا ہے وہ بھی ایک زمانے میں جدید تر تھا۔ ہمارے اسلاف نے اپنے زمانے کے اُن تمام علوم کو جو اُس عہد میں جدید سمجھے جاتے تھے، مدارس کے نصاب میں داخل کیا تھا، ان میں منطق، فلسفہ، طب، علم ہیئت، تمام علوم شامل تھے۔ یہ ہمارے اسلاف کی ژرف نگاہی ہے کہ

> ہم نے جدید علوم کے ساتھ بھی وہی نفرت برتی جو ہم انگریزوں کے ساتھ برت رہے تھے حالانکہ یہ علوم انگریزوں کی ملکیت نہ تھے بلکہ ان کی حیثیت عالمی تھی۔

انہوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق نصاب کی تشکیل کی تھی مگر ہم نے اُن کی پیروی نہیں کی اور ہم نے مدارسِ عربیہ کے نصاب میں وہ جدید مضامین شامل نہیں کیے، جن کا پڑھنا ہمارے دور میں ناگزیر ہو چکا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ غلط فہمی بھی تھی کہ یہ علوم انگریزوں کے لائے ہوئے ہیں اور چونکہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر رکھا تھا اور اس لحاظ سے وہ غاصب اور ظالم تھے، اس لیے ہمارے علماء کو اُن سے نفرت پیدا ہوئی (جو بہر حال بجا تھی) لیکن ہم نے جدید علوم کے ساتھ بھی وہی نفرت برتی جو ہم انگریزوں کے ساتھ برت رہے تھے حالانکہ یہ علوم انگریزوں کی ملکیت نہ تھے بلکہ ان کی حیثیت عالمی تھی۔

پاکستان کے قیام سے قبل صورت یہ تھی کہ مدارس عربیہ کے تعلیم یافتہ کو تعلیم یافتہ ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ علومِ دینیہ کے لیے بھی مدارس کی سند معتبر نہیں سمجھی جاتی تھی۔ صرف علی گڑھ ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں اسلامیات کے شعبہ میں تدریس کے لیے بعض مشہور علماء کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ ورنہ عام حالت یہ تھی کہ جب تک کوئی مولوی یا عالم، خواہ وہ دیوبند کا فارغ التحصیل ہو یا سہارنپور کا، کسی یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ کی سند نہیں رکھتا تھا، اُسے استاذ نہیں کہا جاتا تھا۔

نئے نصاب کی تدوین

قیامِ پاکستان کے کچھ ہی عرصہ بعد ملتان کے مدرسہ خیر المدارس میں مدارسِ عربیہ کے صدر مدرسین کو اور

عام حالت یہ ہے کہ آٹھ سال تک مسلسل عربی پڑھنے کے باوجود مدارسِ عربیہ کے فارغ التحصیل نہ تو عربی بول سکتے اور نہ لکھ سکتے ہیں۔

دوسرے علماء کو دعوت دی گئی کہ وہ نئے حالات کے تحت مدارسِ عربیہ کے لیے ایک ایسا نصاب تجویز کریں جو وقت کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ لیکن افسوس کہ کسی جامع نصاب پر علماء کا اتفاق نہ ہو سکا اور وہی قدیم نصاب جاری رہا جو اب تک اکثر مدارس میں رائج ہے۔

عربی زبان کی تعلیم

البتہ اتنی تبدیلی بعض مدارس میں ضروری ہوئی ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد عربی زبان کی تعلیم پر پہلے سے زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔ بعض مدارس میں عربی کی تعلیم و تدریس کے لیے مصر اور شام کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ ان مدارس میں عربی کا معیار یقیناً بلند ہو چکا ہے اور عربی بولنے اور لکھنے کی استعداد بھی پہلے کے مقابلے میں حوصلہ افزاء ہے۔ جبکہ عام حالت یہ ہے کہ آٹھ سال تک مسلسل عربی پڑھنے کے باوجود مدارسِ عربیہ کے فارغ التحصیل نہ تو عربی بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ صورتِ حال اب آہستہ آہستہ بہتر ہوتی جا رہی ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو پاکستان اور عالمِ عرب اور عالمِ اسلام کے تعلقات بہت گہرے ہو چکے ہیں، پھر آمد و رفت کی سہولتوں میں اضافے کی وجہ سے پاکستانیوں کا بلادِ اسلامیہ کی طرف سفر کرنا بھی سہل ہو گیا ہے، یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر عربی پہلے سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ تاہم اکثر مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کا معیار قابلِ اصلاح ہے اور ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ اب عربی زبان جو ملک میں پڑھائی جائے اُس کا نصاب اور طریقِ تدریس جدید خطوط پر استوار کیا جانا چاہیے۔ زبان کی دو حیثیتیں

ہیں: ادبی زبان اور روزمرہ میں استعمال ہونے والی زبان جو دفتروں، اسکولوں، کالجوں اور بازاروں میں استعمال ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں دینی مدارس میں اور کالجوں میں جو زبان پڑھائی جاتی ہے وہ دراصل کلاسیکل عربی ادب کا حصہ ہے نہ کہ روزمرہ عربی۔ چنانچہ یہ زبان روزمرہ کی زندگی اور معاملات میں کام نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس اور کالجوں میں عربی پڑھنے والے جدید عربی میں نہ تو لکھ سکتے ہیں اور نہ گفتگو کر سکتے ہیں۔

ندوہ کے قیام کی غایت

[ندوہ سے متعلق میرے سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا]

ندوہ کے قیام کی بنیادی غرض وغائت یہ تھی کہ علماء کو وہ علوم بھی پڑھائے جائیں جن کا پڑھنا اور جاننا اُس وقت ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ندوہ کے نصاب میں تاریخ، جغرافیہ، حساب، الجبراء، جیومیٹری، انگریزی، بنیادی سائنس اور معلوماتِ عامہ کو شامل کیا گیا اور میٹرک تک کی سطح پر یہ مضامین شامل نصاب کیے گئے۔ ندوہ کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہاں عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھایا جاتا تھا اور عربی زبان کے نصاب میں مصر، شام اور عراق میں رائج شدہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں تاکہ عربی زبان پر قدرت حاصل ہو اور جدید عربی لکھنے اور بولنے کی استعداد پیدا ہو۔ پھر ندوہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ قدیم فلسفہ کی مقدار کو بہت کم رکھا گیا تھا البتہ قرآن، حدیث اور فقہ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ قدیم مدارس کے کچھ علماء نے اس نصاب کی مخالفت بھی کی اور اسے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ندوہ کی آواز مدارسِ عربیہ کے در و دیوار سے بھی آنے لگی اور جدید علوم کی اہمیت کا اعتراف کیا جانے لگا۔

ندوہ کے نصاب میں مزید تبدیلیاں

[میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا ندوہ نے ابتدائی جدت کے بعد بھی کوئی تبدیلی کی کوشش کی ہے، مولانا نے فرمایا]

ندوہ کا مزاج یہ ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے غلو اور انتہا پسندی کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی جائے اور اسلام کو اس کے حقیقی مآخذ کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

ندوہ نے اپنے نصاب میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کی ہیں مثلاً تقسیم کے بعد انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی زبان بھی پڑھائی جارہی ہے۔علومِ دینیہ کی متعدد کُتب کا ترجمہ ہندی زبان میں کیا جاچکا ہے۔

علماء کا ندوہ پر اعتراض

[میرے اس سوال کے جواب میں کہ ندوہ کے نصاب کے خلاف قدیم مدارس کے علماء کا بنیادی اعتراض کیا تھا، مولانا نے فرمایا]

بنیادی اعتراض علماءِ مدارس کا یہ تھا کہ ان علوم کے پڑھنے والوں میں تجدد آجائے گا اور مدارس کے طلبہ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کا رنگ اختیار کرلیں گے نیز یہ کہ ان طلبہ کا دین سے وہ تعلق نہیں رہے گا جو ہونا چاہیے۔

ندوہ کا بنیادی مزاج

ہرادارہ کا ایک مزاج ہوتا ہے۔علماءِ دیوبند کا اپنا مزاج ہے.....یعنی وعظ، حدیث کا درس اور فقہی مسائل میں حنفیت پر زور۔ندوہ کا مزاج یہ ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے غلو اور انتہا پسندی کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی جائے اور اسلام کو اس کے حقیقی مآخذ کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ندوی علماء معتدل ہوتے ہیں، مختلف مکاتب کو قریب تر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور جن فقہی مسائل کی بنا پر ماضی میں اختلافات رہے ہیں، ان کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اسلام کی بنیادی تعلیمات پر زور دیتے ہیں اور فروعی مسائل میں غلو نہیں کرتے۔ندوہ کی ایک

لوگوں کا ذہن یہ بن چکا ہے کہ دین خانقاہی نظام ہی میں ہے
اور یہ ذہن بنانے میں خود اِن علماء کا ہاتھ ہے جنہوں نے
دین اور دنیا میں تفریق پیدا کی ہوئی ہے۔

اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اہل ندوہ اپنے اساتذہ سے برملا اختلاف بھی کرتے ہیں۔ علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی آراء سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ دوسری طرف علماءِ دیوبند کی حالت یہ ہے کہ وہ رشیدی، گنگوہی، نانوتوی اور تھانوی پہلے ہیں پھر دیوبندی، پھر سُنّی، پھر حنفی اور اس کے بعد مسلمان جبکہ ندوہ والے پہلے مسلمان پھر سُنّی، پھر حنفی اور آخر میں ندوی۔ مجھے خود ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا خلودِ نہر کے مسئلہ پر ایک خاص موقف تھا جس سے مجھے اختلاف تھا۔ میں نے دلائل سے اپنے اختلاف کا اظہار کیا تو سیّد صاحب نے رجوع فرمالیا۔

ندوہ کی روایت پاکستان میں منتقل نہیں ہوئی

[میرے اس سوال کے جواب میں کہ تقسیم کے بعد جب پاکستان میں دیوبند کی روایت سے متعلق مدارس قائم ہوئے تو ندوہ کی روایت پاکستان میں کیوں منتقل نہ ہوسکی، مولانا نے فرمایا]

یہ بات درست ہے کہ ندوہ کی روایت پاکستان میں منتقل نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ندوہ کے علماء بہت تھوڑی تعداد میں پاکستان آئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ علماءِ ندوہ کا مزاج مدرسے قائم کرنے کا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں مدرسے پیری کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ اس راہ سے سرمایہ ملتا ہے۔ ظاہر

ہے کہ ندوہ کے جدید تعلیمی نصاب کے لیے تو چندہ کوئی دیتا نہیں۔ لوگوں کا ذہن یہ بن چکا ہے کہ دین خانقاہی نظام ہی میں ہے اور یہ ذہن بنانے میں خود اِن علماء کا ہاتھ ہے جنہوں نے دین اور دنیا میں تفریق پیدا کی ہوئی ہے۔

فلسفہ کا نصاب

دینی مدارس میں فلسفہ کا جو نصاب رائج ہے اُس کا بڑا حصہ یونانی فکر پر مشتمل ہے جو سراسر غیر اسلامی ہے۔ ابتداء میں فلسفہ اس وجہ سے دینی مدارس کے نصاب میں شامل کیا گیا تھا کہ اسلام کے خلاف جو فلسفیانہ اعتراضات کیے جاتے ہیں، اُنہیں سمجھا جائے اور پھر اُن کی تردید کی جائے لیکن فی زمانہ مدارس میں فلسفہ کو محض رٹا دیا جاتا ہے اور اس کا تنقیدی مطالعہ نہیں کرایا جا سکتا۔ ندوہ میں صورت اس کے برعکس ہے۔ ندوہ میں غیر اسلامی فلسفے کا نصاب کم کیا گیا تھا اور فلسفہ کا مطالعہ تنقیدی نقطۂ نظر سے کرایا جاتا تھا۔

جامعہ اسلامیہ بہاولپور

[جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا]

جامعہ اسلامیہ کا ابتدائی نام جامعہ عباسیہ تھا اور یہ ابتداء ہی سے ایک سرکاری ادارہ تھا۔ جدید مضامین یعنی انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، حساب، معاشرتی علوم، شہریت وغیرہ بھی ابتداء ہی سے اس کے نصاب میں شامل تھے جو درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ یہ مضامین اب بھی شامل نصاب ہیں۔

دراصل ریاست بہاولپور کے ختم ہونے کے بعد اور ون یونٹ بننے کے بعد اس جامعہ کو حکومت کی سرپرستی صحیح معنوں میں حاصل نہیں رہی۔ ہمارے ملک میں کوئی حکومت بھی آج تک ایسی نہیں آئی جو پورے ملک میں قدیم اور جدید علوم کا جامع نصاب پڑھانے کا انتظام کرتی۔ برعکس اس کے کوشش یہ ہوتی رہی کہ خالص دینی

درسِ نظامی کے پورے نصاب کا ازسرِ نو جائزہ لینے کی اور ترتیبِ نو کی اشد ضرورت ہے۔ اس نظام میں بنیادی تغیر بے حد ضروری ہے۔

یونیورسٹی میں بھی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پورے کے پورے مضامین رائج کر دیئے جائیں اور علومِ دینیہ کی مقدار بہت کم رکھی جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر پورے نصاب میں علومِ دینیہ کے مقابلے میں دوسرے علوم کا غلبہ ہوگا تو علومِ دینیہ کے لیے بہت تھوڑا وقت نکل سکے گا اور یہ علوم مغلوب ہو جائیں گے اور اس کے پڑھنے والوں میں وہ استعداد پیدا نہیں ہوگی جو علمائے دین میں ہونی چاہیے۔

نیا نصاب کیسا ہو؟

میں اس بات کا قائل ہوں کہ میٹرک تک نصاب مشترک ہو، یعنی مدارس اور عام اسکولوں کا نصابِ تعلیم میٹرک تک مشترک رکھا جائے، اس اضافے کے ساتھ کہ جو لوگ میٹرک پاس کرنے کے بعد علومِ دینیہ میں تخصص حاصل کرنا چاہیں اور علماءِ دین بننا چاہیں، اُن کے لیے مڈل اور میٹرک کی جماعتوں میں صرف ونحو یعنی بلاغت اور عربی زبان کی مقدار نسبتاً زائد ہو تاکہ وہ آئندہ اپنی اعلیٰ دینی تعلیم جاری رکھنے کی استعداد مہیا کر سکیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ڈاکٹر بننے والے طلبہ میٹرک میں میڈیکل گروپ کے مضامین پڑھتے ہیں اور انجینئرنگ پڑھنے والے طلبہ میٹرک میں فزکس اور حساب وغیرہ پڑھتے ہیں تاکہ یہ مضامین اُن کی آئندہ تخصیصی تعلیم میں معاون ہو سکیں۔ اس طرح ہم دینی مدارس کے نظامِ تعلیم کو اور عام تعلیمی نظام کو باہم مربوط اور یکجا کر سکتے ہیں۔

میری دوسری تجویز یہ ہے کہ اس مُلک کے نظامِ تعلیم میں عربی زبان کو لازمی قرار دے دیا جائے۔ یہ بات ہمیں سمجھ لینی چاہیے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد جو پاکستان بچ گیا ہے وہ مشرقِ اوسط کا حصہ ہے اور مشرق

معاشی حالات کا اثر بہت ہوتا ہے۔ پسے ہوئے طبقے کی نفسیات مفعول ہوتی ہے اور اس طبقے سے آنے والے بہت کم لوگ حق بات کہنے کی جرأت کرتے ہیں۔

اوسط کی غالب زبان عربی ہے۔ دینی اور معاشی وسیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی اب ہمارا تعلق عالم عرب سے زیادہ ہے۔ لہٰذا عربی زبان کو ایک لازمی زبان کی حیثیت سے شامل نصاب کرنا ضروری ہے۔

نیز درس نظامی کے پورے نصاب کا ازسرِ نو جائزہ لینے کی اور ترتیبِ نو کی اشد ضرورت ہے۔ اس نظام میں بنیادی تغیر بے حد ضروری ہے۔ قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ کے مضامین تو باقی رکھے جائیں (اگرچہ ان کے نصاب میں بھی تغیر کی ضرورت ہے) لیکن ان کے علاوہ دوسرے مضامین میں بالکل نیا نصاب رائج کرنا چاہیے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ علومِ دینیہ کے ساتھ ساتھ دیگر مروجہ مضامین بھی علماء کو پڑھائے جائیں تاکہ علماء علومِ دینیہ کے علاوہ جدید علوم کی مبادیات سے واقف ہوسکیں، مثلاً علوم عمرانیات کی جو اہمیت موجودہ زمانے میں ہے، اس کے پیش نظر ان علوم کے بنیادی مباحث کا شاملِ نصاب کیا جانا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ مدارس کے فارغ التحصیل علماء کی عام معلومات کا عالم یہ ہے کہ ایک بہت بڑے مدرسے سے فارغ التحصیل ایک صاحب جامعہ عباسیہ بہاولپور میں ملازمت کے لیے میرے پاس آئے۔ انٹرویو کے دوران میں نے اُن سے پوچھا کہ مغربی پاکستان کے شمال میں کون سا ملک ہے تو وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ مزید سوالات کرنے پر معلوم ہوا کہ انہیں پاکستان کے ہمسایہ ملکوں میں سے کسی ایک کے بارے میں معلوم نہ تھا۔

فلسفہ کے نصاب میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ فلسفہ کا بالکل نیا نصاب مرتب کیا

جائے۔ قدیم فلسفہ کے صرف وہی مباحث رکھے جائیں جو فی زمانہ اہمیت رکھتے ہوں، نیز جدید فلسفیانہ نظریات مثلاً ۔۔۔یت پسندی، مارکسزم وغیرہ کا مطالعہ بھی شامل کیا جائے اور پھر ان کے مقابلے میں اسلامی فلسفہ کی برتری ثابت کی جائے۔ بالعموم مدارس میں جو طلبہ پڑھنے کے لیے آئے ہیں۔ اُن کا تعلق غریب طبقے سے ہوتا ہے۔ ہندوستان میں بھی تقریباً 50% طلبہ غریب ہوتے تھے اور اُن کے جملہ اخراجات مدارس ہی کے ذمے ہوتے تھے۔ البتہ یو۔ پی اور بہار سے تعلق رکھنے والے بعض خوشحال گھرانے ایسے بھی تھے جو دینی مدارس میں اپنے بچوں کو بھیجتے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ سہارنپور اور رام پور کے مدارس میں یو۔ پی اور بہار کے متعدد زمیندار گھرانوں کے بچے زیرِ تعلیم تھے۔ ندوہ میں بھی بڑی تعداد ایسے طلبہ کی تھی جو اپنے اخراجات سے پڑھتے تھے اور خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں خوش حال اور زمیندار گھرانوں میں دینداری کا جذبہ عام تھا اور وہ اپنے بچوں میں سے بعض کو عالمِ دین بنانا قابلِ فخر سمجھتے تھے۔

لیکن جو علاقے بعد میں پاکستان بنے، وہاں سے بالعموم غریب گھرانوں کے طلبہ ہی مدارس میں آتے تھے اور ان کے اخراجات بھی مدرسہ ہی برداشت کرتا تھا۔ یہ صورت اب بھی ہے۔ میرے نزدیک علماء و مدارس میں حُریتِ فکر کے فقدان کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ معاشی حالات کا اثر بہت ہوتا ہے۔ پسے ہوئے طبقے کی نفسیات مفعول ہوتی ہے اور اس طبقے سے آنے والے بہت کم لوگ حق بات کہنے کی جرأت کرتے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حکام اور وزیروں کے سامنے ہمارے علماء کرام لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔

دراصل مدارس سے فارغ ہونے کے بعد اکثریت امامت اور خطابت کا پیشہ اختیار کرتی ہے۔ اور بعض جگہوں پر تو آئمہ حضرات کو کھانا بھی اس طرح دیا جاتا ہے جس طرح عام گداگروں اور بھکاریوں کو دیا جاتا ہے۔

ندوہ کے فارغ التحصیل علماء میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے امامت اور خطابت کو باقاعدہ پیشہ کے طور پر اپنایا ہو۔ ندوہ کے لوگ بالعموم تصنیف و تالیف اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تدریس کے کام کی طرف گئے ہیں۔ نیز ندوہ کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد صحافت کے میدان میں بھی گئی ہے۔

مولانا احمد سعید

مہتمم و شیخ الحدیث

مدرسہ عربیہ سراج العلوم، سرگودھا

مئی ۱۹۷۵ء

www.KitaboSunnat.com

آپ دوآبہ، ضلع میانوالی کے معروف علمی حکیم خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے اور مدرسہ سراج العلوم کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع (۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ابتدائی دینی کتب سے لے کر اعلیٰ کتب کی تعلیم مدرسہ سراج العلوم سرگودھا میں اپنے والد کے علاوہ حضرت مولانا محمد ساکن عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی سے حاصل کی۔ آپ نے ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں دارالعلوم دیوبند(ہندوستان) میں داخلہ لیا اور دورہ حدیث کی تعلیم حاصل کر کے سند فراغت حاصل کی۔ اس دوران مولانا سیّد حسین احمد مدنی (۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) سے بخاری شریف اور ترمذی شریف، حضرت مولانا مفتی محمد ریاض الدین (۱۳۶۲ھ/۱۹۴۲ء) سے نسائی شریف، حضرت مولانا نافع گل (۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء) سے موطا امام مالک اور موطا امام محمد، حضرت مولانا شمس الحق افغانی سے طحاوی شریف اور سنن ابن ماجہ شریف، حضرت مولانا اعزاز علی (۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء) سے شمائل ترمذی، مسلم شریف کے بعض اسباق کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے ہم درس حضرات مولانا امیر گل، درابن کلاں، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان، مولانا قاضی

عبدالکریم کلاچوی اور مولانا قاری عبدالرحمان "بلبل پنجاب" تھے۔ آپ نے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا ابوالخیل خان محمد صاحب، سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ، کندیاں، ضلع میانوالی کے دست مبارک پر بیعت کی اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور ریاضتوں کی بدولت اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔

آپ کا انتقال سرگودھا میں ہوا۔

ابتدائی تعلیم

ابتدائی عربی اور دینی تعلیم پنجاب کے مختلف مدارس میں حاصل کی۔ عربی کی کچھ کُتب اپنے والد صاحب مرحوم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد ایک سال کے لیے دیو بند گیا جہاں مولانا حسین احمد مدنی سے دورۂ حدیث پڑھا۔ دیو بند سے واپس آیا تو مدرسہ سراج العلوم میں، جو والد مرحوم کے اہتمام میں چل رہا تھا مدرس بن گیا اور اب گذشتہ سال سے شیخ الحدیث مقرر ہوا ہوں اور بخاری اور ترمذی پڑھاتا ہوں۔

مدرسہ سراج العلوم

یہ مدرسہ میرے والد مرحوم مفتی محمد شفیع صاحب نے قائم کیا تھا۔ وہ اس مدرسے کے مہتمم اور شیخ الحدیث تھے۔ ان کے زمانے میں مدرسین کی تعداد چار تھی جبکہ اس وقت آٹھ مدرسین ہیں۔

مدرسہ کا نصاب

یہاں مدرسے میں پورا درسِ نظامی پڑھایا جاتا ہے البتہ فارسی کی تعلیم کا با قاعدہ پڑھنے والا طالب علم آ جائے تو اس کو پڑھا دیتے ہیں۔ تاہم فارسی کی تعلیم کا با قاعدہ انتظام نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ طلبہ میں فارسی پڑھنے کا رجحان کم ہو گیا ہے۔ البتہ عربی کی مکمل تعلیم یعنی دورۂ حدیث تک پڑھائی جاتی ہے۔

جو طلبہ با قاعدہ درس نظامی کی مکمل تعلیم کے لیے مدرسہ میں آتے ہیں ان کی تعداد بالعموم ایک سال میں ستّر اور اسّی کے درمیان رہتی ہے۔ مقامی طلبہ جو صرف قرآن ناظرہ پڑھنے آتے ہیں ان کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ بیرونی طلبہ کے قیام و طعام کا ذمہ دار مدرسہ ہے۔ عموماً زیادہ طلبہ ہمارے مدرسہ میں ڈیرہ اسماعیل خان، ہزارہ اور پشاور کے نواح سے آتے ہیں۔ ابتدائی چند سالوں میں برما سے آنے والے طلبہ کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی تھی لیکن اس کے بعد ہم نے خود ان کی تعداد کم کر دی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ہم نے دیکھا کہ ان میں پڑھنے سے زیادہ پیسہ کمانے کا شوق زیادہ ہوتا تھا۔ تعلیم کے دوران ہی کسی نے ٹیوشن رکھی ہوتی تھی،

کوئی امامت یا پرائیویٹ ملازمت کر لیتا تھا اور اس طرح پڑھائی کی طرف اُن کی توجہ کم ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے امتحانات میں برمی طلبہ کے نمبر بہت کم ہوتے تھے اور بعض کو تو رعائتی طور پر پاس کرنا پڑتا تھا۔ اس چیز سے ہم تنگ آ گئے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ برمی طلبہ کے مزاج میں کچھ شرارت بھی تھی۔ ہر سال وہ کوئی نہ کوئی فساد ضرور کرتے تھے۔ آپس میں لڑتے تھے۔ دوسرے طلبہ سے لڑ جاتے تھے، طلبہ کی جماعتیں بنانے لگتے تھے، اور جماعتیں بنا کر ہڑتالیں کرانے کی کوشش کرتے تھے...... آج کھانا نہیں کھاتے، یہ ہڑتال ہے...... آج سبق نہیں پڑھتے، یہ ہڑتال ہے، وغیرہ وغیرہ۔ غرض ان کی ذہنیت کچھ انقلابی قسم کی تھی۔ ہم نے سوچا کہ تعلیم میں تو یہ کمزور ہیں اور تنگ کرنے میں بہت تیز ہیں۔ چنانچہ ہم نے ان کی تعداد کم کرنی شروع کر دی۔ یہ کام ہم نے بتدریج کیا اور کوٹہ مقرر کرنا شروع کر دیا۔ پہلے سال ۲۵ کا کوٹہ مقرر کیا، اس کے بعد ۲۰، پھر ۱۵ اور اب دس کا کوٹہ مقرر ہے۔ یعنی یہ کہ دس سے زیادہ برمی طلبہ ایک سال میں ہم نہیں لیں گے۔ چنانچہ اب طلبہ کی زیادہ تعداد صوبہ سرحد سے ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد پنجاب کی۔

امتحانات

ہمارے ہاں کئی طرح کے امتحانات ہوتے ہیں۔ ایک تو ہے داخلے کا امتحان۔ جب کوئی طالب علم مدرسہ میں داخلے کے لیے آتا ہے تو ہم اُسے ایک چھپا ہوا فارم دے دیتے ہیں۔ اُس فارم میں طالب علم یہ لکھتا ہے کہ وہ کون کون سے اسباق یا کُتب پہلے پڑھ چکا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اسباق مطلوبہ بھی لکھتا ہے یعنی وہ اسباق یا کُتب جو وہ اس مدرسے میں پڑھنا چاہتا ہے۔ جو کتابیں وہ پہلے پڑھ چکا ہے اس کا ہم امتحان لیتے ہیں، اگر وہ ان میں کامیاب ہو جائے تو ممتحن لکھ دیتا ہے کہ ان اسباق یا کُتب میں طالب علم کی حالت درست ہے۔ چنانچہ اُسے اسباق مطلوبہ مل جاتے ہیں اور اگر ان کتابوں کے امتحان میں وہ کمزور نظر آئے جو وہ پہلے پڑھ چکا ہے تو اسے ان کتابوں کی تعلیم دُہرانا پڑتی ہے اور اسباق مطلوبہ نہیں دیئے جاتے۔

داخلے کے امتحان کے علاوہ سہ ماہی ششماہی اور سالانہ امتحانات بھی ہوتے ہیں۔

فارغ التحصیل طلبہ کی ملازمتیں

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ طلبہ جو مولویوں کے بیٹے ہوتے ہیں وہ تو بالعموم باپ کی جگہ پر امامت یا خطابت سنبھال لیتے ہیں۔ اکثر طلبہ دیہات یا شہروں میں مساجد میں امام اور خطیب بن جاتے ہیں۔ جو بہت ذہین طلبہ ہوتے ہیں وہ مدارس میں استاد بن جاتے ہیں مگر یہ وہ طلبہ ہوتے ہیں جنہیں کتابیں از بر ہوتی ہیں اور وہ یہ کتابیں پڑھا سکتے ہیں۔ بعض طلبہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مطب کر لیتے ہیں۔ یہ طلبہ دورانِ تعلیم یا تعلیم مکمل کرنے کے بعد طب بھی پڑھتے ہیں۔ گویا ان طلبہ کے لیے جو راستے کھلے ہیں وہ بالعموم چار ہیں...... امامت، خطابت، تدریس اور طب۔

> [میرے اس سوال کے جواب میں کہ...... ''بعض مدارس میں یہ سہولت بھی رکھی جاتی ہے کہ طلبہ کو ایسے فنون سکھا دیئے جاتے ہیں کہ وہ اپنی معاش بآسانی حاصل کر سکیں مثلاً کتابت، خوش نویسی، طب، لکڑی وغیرہ کا کام وغیرہ، کیا آپ کے مدرسے میں بھی یہ سہولتیں موجود ہیں''...... مولانا نے فرمایا]

ہمارے مدرسے میں فی الحال تو ایسا انتظام نہیں لیکن یہ تجویز ہمارے ذہن میں ہے کہ ہم ایسا شعبہ یا شعبے یہاں قائم کر سکیں جہاں طلبہ بعض فنون سیکھ کر دین کے ساتھ ساتھ معاش کمانے کی صورت بھی پیدا کر سکیں۔ جو طالب علم پڑھنا چاہیں، اُنہیں ہم طب شروع کرا دیتے ہیں، لیکن ابھی تک ہم نے طب کی تعلیم لازمی قرار نہیں دی۔ البتہ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ جب ہمارا مدرسہ احاطہ مسجد سے باہر چلا جائے گا تو ہم فنون کے شعبے بھی شروع کریں گے۔ ہم نے مدرسے کے لیے چالیس کنال زمین حکومت سے سیٹلائٹ ٹاؤن میں حاصل کی ہے، آدھا مدرسہ وہاں منتقل ہو چکا ہے، تین مدرس وہیں پڑھاتے ہیں، جب سارا مدرسہ وہاں منتقل ہو جائے گا تو ہمارا ارادہ ہے

کہ دستکاری یا دیگر فنون مثلاً خوش نویسی، درزی کا کام، جلد سازی، وغیرہ بھی سکھائیں گے۔

نصاب میں تبدیلی

[میرے اس سوال کے جواب میں کہ...... "بعض مدارس نے درسِ نظامی میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں، بعض کُتب ختم کر دی گئی ہیں اور بعض نئی کُتب شامل کر لی گئی ہیں۔ بعض مدارس میں انگریزی زبان اور علوم عمرانیات بھی پڑھائے جا رہے ہیں، آپ کا خیال ان تبدیلیوں کے بارے میں کیا ہے؟ نیز کیا اس طرح کی کوئی کوشش آپ کے ہاں ہوئی ہے؟ یا آپ اس طرح کی کوشش کرنا پسند فرمائیں گے"......مولانا نے فرمایا]

یہ کوشش بہت اچھی ہے اور ہمیں پسند بھی بہت ہے لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے ہم سے ابھی تک اس پر عمل نہیں ہو سکا۔ یہ سعی اس لحاظ سے اچھی ہے کہ دین اور دُنیا دونوں کا خیال رکھنا ضروری ہے تا کہ جو شخص دین کی تعلیم حاصل کرے وہ دنیاوی معلومات کا بھی حامل ہو۔

اس سلسلے میں ہمارا ارادہ یہ بھی تھا کہ ہم اپنے ہاں مولوی فاضل کی کلاسیں شروع کر دیں تا کہ اسکولوں میں عربی اور دینیات پڑھانے کے لیے بہتر اساتذہ مہیا ہو سکیں۔ اسکولوں میں سے اکثر حضرات ہم سے یہ کہتے ہیں کہ جب کبھی ہمیں مولوی فاضل کی ضرورت پڑتی ہے تو یا شیعہ ملتا ہے یا مرزائی ملتا ہے، کوئی سنّی مسلمان نہیں ملتا جو اسکولوں میں عربی یا اسلامیات پڑھا سکے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ہم نے ایک ریٹائرڈ مولوی فاضل ٹیچر کو اپنے مدرسہ میں ملازم رکھا تا کہ وہ ہمارے طلبہ کو مولوی فاضل کا کورس پڑھا دیا کریں مگر انہوں نے کہا کہ میں اکیلا سارا کورس نہیں پڑھا سکتا۔ اس کے لیے دو مستقل مدرسین کی ضرورت ہے۔ دوسرا مدرس ہمیں بروقت مل نہ سکا حالانکہ اُس سال ہم نے اشتہار بھی چھپوا دیا تھا۔ چنانچہ یہ کلاس ادھوری ہی رہ گئی اور اس کے بعد سے اب تک یہ پروگرام التواء میں پڑا ہوا ہے۔

جہاں تک نصاب کا تعلق ہے تو ہم چونکہ اپنے مدرسہ کا الحاق وفاق المدارس ملتان کے ساتھ کر چکے ہیں، لہٰذا ہم وہی نصاب پڑھا رہے ہیں جو وفاق المدارس کے دیگر مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ کچھ جدید کتابیں بھی ہم نے نصاب میں شامل کر لی ہیں اور یہ کتابیں وہ ہیں جو مولوی فاضل کے امتحان میں معاون ہو سکتی ہیں۔ بعض تاریخ کی کُتب بھی ہم نے شامل کی ہیں اور عروض وقوافی پر بھی کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ کُتب کو غیر ضروری سمجھ کر ہٹا دیا گیا ہے۔ ان میں منطق اور فلسفہ کی وہ کتابیں شامل ہیں جو اب متروک ہو چکی ہیں۔ مثلاً ایک کتاب ہے امورِ عامّہ جو علم کلام اور فلسفہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے مگر اس میں ساری کی ساری منطق بھری پڑی ہے اور اس میں عقائد کا بیان نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے اسے بھی نصاب سے نکال دیا ہے، اس طرح قاضی مبارک جو منطق پر ایک اونچی کتاب ہے اور بہت ادق اور مشکل ہے، اسے بھی ہٹا دیا گیا ہے۔ حمد اللہ ایک اور منطق کی کتاب تھی جسے ہٹا دیا گیا ہے۔ البتہ مُلاّ حسن اور مُلاّ جلال کو ہم نے باقی رکھا ہے۔ فلسفہ میں صدرہ اور شمس بازغہ بھی مشکل اور غیر ضروری کتابیں تھیں، اس لیے ان کو بھی نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔

البتہ ہمارے مدرسہ میں ایک کمی ابھی تک باقی ہے اور خیال ہے کہ انشاء اللہ اگلے سال اس کی تلافی کر دیں گے۔ یعنی یہ کہ وفاق المدارس نے جس طرح درسِ نظامی میں تبدیلیاں کیں اور بعض کتابوں کو ہٹایا اور بعض نئی کُتب کو شامل کیا، اس طرح انہوں نے مختلف جماعتوں کی درجہ بندی بھی کی تھی...... یعنی پہلی جماعت، دوسری جماعت، تیسری جماعت وغیرہ، اس کی بے حد ضرورت تھی۔ اس لیے کہ ہمارے طلبہ نہایت بے ترتیبی کے ساتھ کتابیں شروع کر دیتے ہیں مثلاً ایک کتاب تو ہے پہلی جماعت کی اور دوسری کتاب ہے آٹھویں جماعت کی اور یہ دونوں کتابیں وہ ساتھ ساتھ شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ میرے اپنے زمانۂ تعلیم میں ہمارا ایک ساتھی جو افغانستان سے آیا تھا، ایک طرف تو نحو میر پڑھ رہا تھا جو نحو کی بالکل ابتدائی کتاب ہے اور دوسری فقہ میں ہدایہ پڑھ رہا تھا جو فقہ میں آخری کتاب سمجھی جاتی ہے اور مشکل بھی ہے۔ ہم اُس سے کہتے تھے

کہ یہ تم کیا کرتے ہو، نحو تو تم نے پڑھی نہیں ہے اور ہدایہ کا مصنف تو بہت بڑا نحوی ہے، تم اُسے سمجھو گے کیسے؟ عبارت کیسے پڑھو گے، اس پر وہ ہنس کر کہتا تھا:

''مولانا! عبارت نے خوانم ولیکن مطلب خوب مے کشم''

تو یہ بے ترتیبی ہمیں بہت تنگ کرتی ہے۔ ایک ٹانگ طالب علم کی زمین پر ہوتی ہے تو دوسری آسمان پر۔ وفاق المدارس نے اس بے ترتیبی کو دُور کرنے کے لیے جماعت بندی کر دی تھی لیکن ہم ابھی تک جماعت بندی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ طلبہ جو کتابیں باہر سے پڑھ کر آتے ہیں اُن کو دوبارہ پڑھنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور جماعت بندی میں بعض اوقات بعض کتابیں دوبارہ بھی پڑھنا پڑ جاتی ہیں۔ اگر ہم زیادہ اصرار کریں تو مدارس تو اور بھی بہت ہیں۔ طالب علم کسی دوسرے مدرسے میں چلا جاتا ہے جہاں جماعت بندی نہ ہو لیکن اب ہمارا پختہ ارادہ ہے کہ جماعت بندی ضرور کریں گے۔

مدرسہ اور طلبہ کی کفالت

طالب علموں کی جملہ تمام ضروریات کا مدرسہ خود کفیل ہے۔ کھانا پینا، رہائش، چارپائی، روشنی، صابن، تیل، حجامت وغیرہ سب مدرسے کے ذمے ہے۔ سال میں ایک مرتبہ طلبہ کو کپڑے بھی سِلا کر دیئے جاتے ہیں۔ نقد وظیفہ اس حساب سے دیا جاتا ہے:

ابتدائی طلبہ:	چار روپے ماہانہ
متوسط طلبہ:	چھ روپے ماہانہ
منتہی طلبہ:	آٹھ روپے ماہانہ
دورۂ حدیث کے طلبہ:	دس روپے ماہانہ

طلبہ کی حالت یہ ہے کہ جو استاد نے بتا دیا اُسی کو یاد کرلیا اور ''جی ہاں''
''جی ہاں'' کردیا۔ ان میں اتنی قابلیت ہرگز نہیں ہے کہ وہ استاد سے
کچھ سوال کرسکیں یا اختلاف کرسکیں اور اگر استاد کوئی غلطی کر رہا ہو تو
اس غلطی کی نشاندہی کرسکیں۔

اگر کوئی طالب علم بیمار ہو جائے تو علاج بھی مدرسہ کی طرف سے کرایا جاتا ہے البتہ اگر وہ کسی بھی بڑی بیماری کا شکار ہو جائے تو کرایہ وغیرہ دے کر اُسے گھر پہنچا دیا جاتا ہے [میرے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے بتایا کہ] اس وقت مدرسہ میں
درسِ نظامی کے طلبہ میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے اخراجات کا خود کفیل ہو۔

طلبہ کے مشاغل

[میرے اس سوال کے جواب میں کہ ''تعلیم کے اوقات کے بعد فارغ اوقات میں طلبہ بالعموم کیا کرتے ہیں'' مولانا نے بتایا] جو طلبہ سیٹلائیٹ ٹاؤن والے حصے میں مقیم ہیں، وہ تو فارغ اوقات میں والی بال کھیلتے ہیں، مدرسہ نے ایک Net اور والی بال اُن کو دے رکھا ہے اور روزانہ عصر سے مغرب تک وہ کھیلتے ہیں۔ جو طلبہ مسجد میں رہتے ہیں ظاہر ہے کہ مسجد میں تو اُن کے کھیلنے کی کوئی جگہ ہوتی نہیں، لہٰذا وہ اپنے طور پر تفریح کے لیے کمپنی باغ چلے جاتے ہیں اور وہاں والی بال کی جو ٹیمیں کھیل رہی ہوتی ہیں، اُن میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر یوں ہی کمپنی باغ میں گھوم پھر واپس آجاتے ہیں۔

طلبہ کا تعلیمی معیار

اس زمانے میں تو بہت کم طلبہ ایسے آئے ہیں جو اعلیٰ تعلیمی معیار رکھتے ہوں اور اساتذہ سے اختلاف رائے کی جرأت بھی کرتے ہوں۔ اس سال ہمارے پاس جو اسّی کے لگ بھگ طالب علم ہیں، اُن میں تین چار طالب علم ہی اس صلاحیت کے ہیں کہ وہ اپنے طور پر مطالعہ کرتے ہیں اور اس مطالعے سے نتائج اخذ کر کے اساتذہ سے سوالات کرتے ہیں اور بعض اوقات اعتراضات بھی کرتے ہیں۔ باقی طلبہ کی حالت یہ ہے کہ جو استاد نے بتادیا اُسی کو یاد کرلیا اور "جی ہاں" "جی ہاں" کردیا۔ ان میں اتنی قابلیت ہرگز نہیں ہے کہ وہ استاد سے کچھ سوال کرسکیں یا اختلاف کرسکیں اور اگر استاد کوئی غلطی کررہا ہو تو اس غلطی کی نشاندہی کرسکیں۔ جن چار طلبہ کا میں نے ذکر کیا ہے وہ منتہی کے طالب علم ہیں۔ دورے کے طلبہ میں سے تو ایک طالب علم ایسا بھی ہے جو ایک بار نیوٹاؤن کراچی میں مولانا یوسف بنوری صاحب سے دورہ پڑھ چکا ہے اور اب پھر ہمارے ہاں پڑھ رہا ہے۔ پھر بھی اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ کسی بات میں درپئے تحقیق ہو اور سوالات اُٹھا سکے۔ سمجھتا تو وہ ہے اور جب میں کوئی چیز پوچھتا ہوں تو جواب میں تقریر بھی کردیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بات کو سمجھ رہا ہے لیکن اتنی قابلیت پھر بھی نہیں ہے کہ آزادانہ سوالات پوچھ سکے۔

> [میرے اس سوال کے جواب میں کہ "کیا طلبہ نصابی کُتب کے علاوہ بھی کتابوں، رسالوں اور اخبارات وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مولانا نے کہا] طلبہ کو نصاب کے علاوہ مطالعہ کا وقت ہی نہیں ملتا۔ ہمارے ہاں چند ایک رسالے ضرور آتے ہیں مثلاً خدام الدین اور بینات وغیرہ، لیکن میں نے دیکھا ہے کہ طلبہ میں ان کے مطالعے کی رغبت نہیں ہے۔ اخبار بھی آتا ہے لیکن طلبہ اخبار بھی نہیں پڑھتے۔

ریڈیو

س: کیا آپ اپنے بارے میں یہ بتانا پسند کریں گے کہ کیا آپ ریڈیو سنتے ہیں؟

ج: جی نہیں۔ میں ریڈیو سننا ناجائز سمجھتا ہوں۔ صرف جنگ کے زمانے میں خبریں سننے کے لیے میں نے ریڈیو کسی دوست سے مانگ لیا تھا۔

کُتب، اخبارات ورسائل کا مطالعہ

س: آپ اخبار اور رسائل باقاعدگی سے مطالعہ فرماتے ہیں؟

ج: میں خود بھی رسائل پڑھنے کا شوقین نہیں ہوں۔ اگرچہ میرے نام کئی رسائل مفت آتے ہیں لیکن میں دوستوں کو دے دیتا ہوں۔ مجھے نہ اخبار پڑھنے کا وقت ملتا ہے اور نہ رسائل پڑھنے کا۔ البتہ کبھی کبھی اخبار اُٹھا کر سرخیاں دیکھ لیتا ہوں۔ کتابیں بھی پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ سوائے تفسیر اور حدیث کے اور کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کرتا۔ آج کل عموماً تفسیر کا مطالعہ کرتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں سوچتا ہوں ایسی کتابوں کا مطالعہ کیوں نہ کروں جو میرے کام سے متعلق ہیں اور جن کے مطالعے سے مجھے ثواب بھی ملے گا۔ باقی جہاں تک سیاسیات، معاشیات وغیرہ کی کُتب کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرا مزاج ان موضوعات سے مناسبت ہی نہیں رکھتا۔ چنانچہ ان موضوعات پر کتابیں دیکھنے سے مجھے کیا فائدہ؟ ایسی کتابیں کیوں نہ پڑھوں جن کے پڑھنے سے ثواب بھی ملتا رہے۔

[میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا آپ ایسے مصنف کا نام لے سکتے ہیں جسے آپ نے پڑھا ہو یا جو آپ کو پسند ہو، مولانا نے فرمایا] میں نے کسی مصنف کی کوئی کتاب باتمامہ دیکھی ہی نہیں [اس پر جب میں نے مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام لیے تو مولانا نے فرمایا]

علی میاں اگرچہ بہت بڑے عالم ہیں اور ان کا شہرہ بھی بہت سُنا ہے لیکن ان کی کوئی کتاب ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری۔ مولانا حسین احمد مدنی صاحب میرے اُستاد تھے، ان کی کچھ علمی تقاریر پر جو میرے دورانِ تعلیم کے زمانے کی ہیں۔ میرے پاس محفوظ ہیں، اس کے بعد میں نے اُن کی بھی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ ایک دفعہ ان کی خودنوشت سوانحِ حیات ''نقشِ حیات'' ایک صاحب نے دی۔ میں نے اُسے اٹھا کر درمیان سے کھولا اور درمیان سے کچھ حصہ دیکھا جس میں اُن کی ہجرتِ مکہ کا ذکر تھا۔ میں نے دیکھتے ہی کتاب رکھ دی اور سوچا کہ یہ اُن کے حالات ہیں جو گزر چکے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ میں اِسے رکھ دوں اور قرآن پڑھوں۔ وہ تو مہاجر بن کے گئے بھی اور واپس بھی آ گئے، پھر اُن کا انتقال بھی ہو گیا۔ یا تو میں بھی مہاجر بن جاتا اور اِس نقطۂ نظر سے پڑھتا کہ مہاجر کسے کہتے ہیں، میں تو یہیں بیٹھا ہوں۔ چنانچہ میں نے اس کو بھی رکھ دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی کُتب پڑھنے کا بہت شوق ہے مگر آج تک کوئی ایک کتاب نہیں دیکھی۔ اتفاق دیکھیے کہ گزشتہ دنوں ایک دوست کے ہاں امّ الکتاب دیکھی تو شوق ہوا کہ اِسے پڑھا جائے۔ چنانچہ میں مطالعہ کے لیے لے گیا، وہاں سے ایک اور دوست کے ہاں گیا تو وہ کتاب وہیں چھوڑ آیا۔ چنانچہ اس طرح یہ کتاب بھی نہ پڑھ سکا۔

تفسیر اور حدیث کی کُتب بھی صرف متقدمین کی دیکھتا ہوں، عربی زبان کی۔

فلم اور ٹی وی

فلم اور ٹیلی ویژن کو میں سراسر فحاشی سمجھتا ہوں۔ اگر اِن میں اچھی تہذیب ہوتی اور فحاشی نہ ہوتی تو شاید مباح ہو جاتی کیونکہ سینما اور ٹی وی کی تصویر وہ تصویر نہیں ہے جسے ہم شرعاً حرام سمجھتے ہیں، یہ تو ایک عکس ہے جو کپڑے کے اوپر قائم نہیں رہتا۔ پردہ پھر ویسے کا ویسا ہی صاف رہتا ہے۔ اگر فحاشی کا معاملہ نہ ہوتا تو پھر جواز تک پہنچنے کا امکان تھا۔ مگر یہ جو آج کل سینماؤں کے باہر تصویریں ہم دیکھتے ہیں کہ بوس و کنار ہو رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ فلم کے اندر بھی یہی کچھ دکھاتے ہوں گے، تو پھر مخربِ اخلاق چیز ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان مرد تو کجا نوجوان عورتیں

بھی ایسی فلموں کو دیکھ دیکھ کر بے حیا ہوگئی ہیں اور کہتی ہیں کہ جو کچھ ہم فلموں میں دیکھتی ہیں ہم بھی وہی کریں۔

[میرے اس سوال کے جواب میں ''اگر فلم اسلامی تعلیمات یا اسلامی شعائر پر مبنی ہو تو کیا آپ اسے مباح یا جائز قرار دیں گے، مثلاً سورہ رحمان کی فلم یا خانۂ خدا میں حج کے مناظر دکھائے گئے تھے'' مولانا نے کہا]

میں تو سورۂ رحمان کی فلم یا خانۂ خدا یا دیارِ حبیب جیسی فلموں کو مباح نہیں کہوں گا کیونکہ یہ قرآن اور مقاماتِ مقدسہ کو اس شکل اور اس مقام پر دکھانے کی کوشش ہے جس مقام سے ہزاروں مرتبہ لغویات بھی دکھائی جاچکی ہیں۔ یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ سورۂ رحمان کی فلم دیکھنے سے اثر ہوسکتا ہے تو کیا سورۂ رحمان کو پڑھنے سے اثر نہیں ہوتا۔ اگر فلموں ہی کے ذریعے تبلیغ مقصود ہوتی تو رسول کریمؐ پر کتاب نازل نہ ہوتی بلکہ ایک لمبی سی فلم نازل ہوگئی ہوتی۔

چاند اور انسان

چاند پر انسان کا پہنچنا ممکن ہے کیونکہ اسلامی روایات میں نہ صراحتہً نہ کنایتہً کوئی ایسی بات ملتی ہے کہ انسان چاند تک نہ پہنچ سکے۔ خدا کے ذرائع عجیب وغریب ہیں اور ان ذرائع کو کام میں لا کر چاند تک پہنچنے کا امکان ہے۔ لیکن اِسے ماننا بھی ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ ایک تو یہ بات کہنے والے کافر ہیں کہ وہ چاند پر پہنچ گئے ہیں، اور کافر کی بات کا کیا یقین، دوسرے یہ کہ یہ ہماری نادیدہ چیز ہے...... اور اگر پہنچ گئے ہیں تو اس سے انکار کی بھی ہمیں کوئی ضرورت نہیں...... ہوسکتا ہے پہنچ گئے ہوں۔

خاندانی منصوبہ بندی

یہ خیال کرنا کہ آبادی کم ہونی چاہیے تاکہ غربت رفع ہوجائے اور آبادی زیادہ ہوئی تو کھائیں گے کہاں سے، اور اس خیال کے تحت برتھ کنٹرول کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ درپردہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقی کا انکار ہے اور اپنے اوپر اس بھروسے کا اعلان ہے کہ ہم خود اپنے کفیل ہیں۔ حالانکہ اس کے بارے میں تو نص موجود ہے۔ بخاری

ایک علاقے کے چیدہ علماء جمع ہو کر، اپنے دماغی نچوڑ کو ظاہر کریں اور جس فیصلے پر سب کا اتفاق ہو جائے، اُس کو بحیثیت اجماع کے اپنا لیں اور ہر ایک اپنا اپنا اجتہاد نہ کرے کیونکہ اس میں فساد اور انتشار کا ڈر ہے۔

کی حدیث ہے کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں چار ماہ کا ہوتا ہے تو اُس وقت سے اس کا رزق اور اس کی عمر اور اس کا سعید ہونا یا نہ ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ رزق تو وہ ماں کے پیٹ سے لکھا کر لاتا ہے۔ اب جو خدا نے اُس کے لیے رزق لکھ دیا ہے، وہ ناممکن ہے کہ اُسے نہ ملے۔ جو بچے بھی پیدا ہو رہے ہیں وہ اپنا رزق ساتھ لے کر آ رہے ہیں۔

پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ پہلے زمانے میں ہمارے ہاں ایک ایکڑ زمین سے چار بوری گندم آتی تھی تو اب ایسے بیج، ایسی کھادیں اور ایسے وسائل اللہ تعالیٰ نے مہیا فرما دیئے ہیں کہ ایک ایک ایکڑ میں سے دس دس بوریاں گندم کی آ رہی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ پیداوار میں ترقی بھی فرما رہے ہیں۔ جس طرح انسانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اُسی طرح اللہ تعالیٰ ان کی خوراک میں بھی اضافہ کر رہا ہے۔ اور یقیناً آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ چنانچہ اس نظریئے کے مطابق خاندانی منصوبہ بندی شرعاً ناجائز ہے کہ بچے زیادہ ہونے سے غربت میں اضافہ ہو گا۔ البتہ اگر کوئی جواز ہو سکتا تھا تو اس بنا پر کہ اگر ماں کی صحت خراب ہے تو بچے زیادہ نہ ہوں یا ایک بچہ دودھ پی رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی حمل ٹھہر جائے تو بطور علاج کے کچھ صورت نکالی جا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک چلا رہے ہیں وہ اپنی آسائش کا سامان زیادہ مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے علاوہ دوسرے لوگ کھانے والے تھوڑے ہوں۔

پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر آبادی کم ہوگئی تو ملک کے لیے مجاہد کہاں سے پیدا کرو گے، اب تو مجاہدوں کی تعداد کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ سب سے زیادہ آبادی چین میں ہے تو کیا چین کے لوگ بھوکے مر رہے ہیں؟ بلکہ چین تو دنیا کی

بڑی طاقتوں میں ایک بڑی طاقت شمار ہونے والی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پاکستان کو، جہاں کی زمین بھی زرخیز ہے، آبادی کم کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کو میں قتلِ خفی سمجھتا ہوں۔

اجتہاد

میں چونکہ خود مقلّد ہوں اس لیے میں بھی وہی بات کہوں گا جو ہمارے آئمہ حضرات کہہ چکے ہیں۔ علماء نے اتفاق کیا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ میں اگرچہ اُن علماء کا مقلّد تو نہیں ہوں جنہوں نے اجتہاد کو ختم قرار دیا ہے، مقلّد تو میں امام ابوحنیفہ کا ہوں جو پہلی صدی کے ہیں لیکن جن حضرات نے چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے بارے میں لکھا ہے اُن کا کہنا ہے کہ چوتھی صدی کے اندر ہمیں کوئی ایسا عالم نظر نہیں آتا جس میں اجتہاد کی اہلیت ہو اور اُس میں اجتہاد کی شرائط بھی پائی جاتی ہوں۔ البتہ اجماع اب بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی علماء کسی خاص مسئلہ پر اجماع کر لیں۔ یہ مسئلہ ہماری سمجھ میں آیا ہے کہ حدیث پاک کے مطابق، جس کو مسلمان اچھا دیکھیں، اللہ کے نزدیک بھی وہی اچھی بات ہے، تو اب چونکہ زمانہ اجتہاد کا نہیں ہے تو علماء کا فریضہ یہ ہے کہ اگر کوئی نئی بات آ جائے اور متقدمین مجتہدین کی آراء سے ہمیں واقفیت نہ ہو سکے، یا اُن کے زمانے میں یہ مسئلہ نہ پیش آیا ہو تو ایک علاقے کے چیدہ علماء جمع ہو کر، اپنے دماغی نچوڑ کو ظاہر کریں اور جس فیصلے پر سب کا اتفاق ہو جائے، اُس کو بحیثیت اجماع کے اپنا لیں اور ہر ایک اپنا اپنا اجتہاد نہ کرے کیونکہ اس میں فساد اور انتشار کا ڈر ہے۔ جب چوتھی صدی میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کی نظر آیاتِ احکامیہ قرآنیہ پر، ذخیرۂ حدیث پر اور اقوالِ صحابہ اور اقوالِ فقہا پر ہو، تو آج کل کے زمانے میں تو اور بھی مشکل ہے۔

مولانا مفتی محمد یوسف

صدر مدرس

مدرسہ عربیہ حدیقۃ الاسلام، پشاور

اور

مولانا عبدالرحیم

مہتمم

مدرسہ عربیہ حدیقۃ الاسلام، پشاور

۷۔ مئی ۱۹۷۵ء

مفتی محمد یوسف مرحوم کے والد گرامی کا نام مولانا امیر حسن خان تھا۔ آپ ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے اور ۸ اگست ۱۹۹۴ء کو فوت ہوئے۔

انھوں نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے علاقے کے چھوٹے چھوٹے مدرسوں میں حاصل کی، مفتی محمد یوسف صاحب مرحوم مفتی کفایت اللہ مرحوم کے قائم کردہ مدرسہ امینیہ دھلی کے فارغ التحصیل تھے۔

ریاست سوات پاکستان میں ضم نہیں ھوئی تھی تو وھاں عدالتی فیصلے شریعت کے مطابق ھُوا کرتے تھے۔ مولانا مفتی محمد یوسف والئی سوات کے عدالتی نظا م میں قاضی [جج] تھے۔ اور شریعت کے مطابق مقدمات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔

بعد میں مفتی صاحب اپنے علمی مقام کی وجہ سے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ کے مدرسین میں شامل ھو گئے اور جلد ھی شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کئے گئے۔ آپ کئی سالوں تك دارالعلوم حقانیہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رھے۔ مھتمم دارالعلوم مولانا عبدالحق مرحوم ان کے بے حد قدردان تھے۔ مدرسہ حقّانیہ میں تدریس کے بعد مفتی محمد یوسف نے ایك اور عظیم الشان دینی مدرسہ "دارالعلوم

اسلامیہ" اکوڑہ خٹك میں تدریس کا کام شروع کیا۔ چند سال کے بعد مولانا فتح محمد صاحب امیر جماعت اسلامی ضلع راولپنڈی ان کو اکوڑہ خٹك سے راولپنڈی لے گئے، جہاں سے ان کے شاگرد رشید مولانا عبدالرحیم صاحب ان کو حدیقتہ العلوم پشاور لے آئے۔ اس کے بعد وہ آخر وقت تك حدیقة العلوم میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹك میں مدرس کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے انھوں نے سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ پر الزامات کے جواب میں دو جلدوں میں ۱۹۶۹ ء میں "مولانا مودودیؒ پر اعتراضات کا علمی جائزہ حصہ اوّل ، حصہ دوم" شائع کیں۔ یہ تحقیقی کام انھوں نے ۱۹۶۴ ء میں شروع کیا اور اس کے ساتھ ھی ھفت روزہ "آئین" میں "یہ اتمامِ حجت کا آغاز ھے" کے عنوان سے پندرہ مقالے لکھے۔ انھوں نے حدیقة العلوم پشاور میں بخاری شریف کا سالھا سال تك درس دیا اور دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ھزاروں فتاویٰ سے لوگوں کی خدمت کی۔ (ماخذ تحریر: پروفیسر نور ورجان)

نوٹ: مولانا عبدالرحیم چترالیؒ کے متعلق علاّمہ عبدالرشید ارشدکی یہ تحریر ماهنامه "آئین" لاهور کے شماره دسمبر ۱۹۹۶ء میں شائع هوئی تھی۔اس کا خلاصه بطور تعارف یہاں درج کیا جا رها هے۔

مولانا عبدالرحیم ۱۹۴۲ء میں ضلع چترال کے علاقه "بروزگولده" محمد عیسیٰ خان مرحوم کے هاں پیدا هوئے اور ۱۷ نومبر ۱۹۹۶ء کولیڈی ریڈنگ هسپتال پشاور کے بولٹن بلاك میں فوت هوئے۔

مولانا مرحوم انتهائی وجیهه و شکیل تھے، سرخ و سفید رنگت، علم و دانش اور فهم و فراست کی غماز چمکیلی آنکھیں، باوقار اور پر انوار چهره، خنده رو، کشاده جبیں اور سادگی و متانت کا حسین پیکر تھے۔

مولانا مرحوم طبعی اور فطری طور پر درس و تدریس کی شخصیت تھے۔ تمام علوم دینیه کے ساتھ ساتھ ، قرآن و سنت میں اُن کو مفسرانه اور محدثانه وردك حاصل تھا۔ ان کی مجلس اور گفتگو قرآن و سنت کے حوالوں سے معمور هوتی تھی

اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قضا و قدر نے انھیں دینی علوم میں غیر معمولی بصیرت کے ساتھ ساتھ بے پناہ قوت حافظہ سے بھی بھرہ وافر عطا فرمایا تھا۔

مولانا عبدالرحیم آبائی طور پر چترال کے رھنے والے تھے، لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم و تعلم کے سلسلے میں پشاور میں گزرا۔ راولپنڈی، پشاور روڈ پر حدیقۃ العلوم کے نام سے ایك بھت بڑا دارالعلوم ان کے زیر اھتمام ترقی کی منزلیں طے کرتا رھا ھے جس میں سینکڑوں کی تعداد میں طلباء علوم دینیه حاصل کرتے ھیں۔ اب حدیقۃ العلوم ملك کے اھم اور امتیازی اداروں میں شامل ھو چکا ھے۔

مرحوم کو قرآن عزیز سے خصوصی شغف تھا۔ انھوں نے قرآن کریم کی تفسیر ملك کے ممتاز مفسر شیخ القرآن مولانا محمد طاھر پنج پیر والوں سے پڑھی اور ان کی طرز تفسیر پر ھر سال دینی مدارس کے منتھی طلباء کو دورہ تفسیر پڑھایا کرتے تھے جس میں سینکڑوں کی تعداد میں طلباء شریك ھوتے۔

مولانا مرحوم کے دورہ تفسیر کا یه اعزاز اور امتیاز بھی تھا که اس میں شیخ القرآن مولانا محمد طاھرؒ کے انداز تفسیر کے ساتھ ساتھ عصری مسائل میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر" تفھیم القرآن" سے استفادہ اور افادہ بھی شامل ھوتا، اس طرح مولانا چترالی کا دورہ تفسیر اپنی افادیت کے اعتبار سے دو آتشه ھو جاتا اور طلباء کشاں کشاں ان کے دورۂ تفسیر میں شامل ھوتے۔

مولانا عبدالرحیم چترالی علوم دینیه میں گھری بصیرت رکھنے کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں جماعتِ اسلامی کی جدوجھد میں بھی ھمیشه سرگرم

رہے۔جماعتِ اسلامی سے والہانہ لگاؤ کی وجہ سے بہت جلد جماعت کے صفِ اول کے قائدین میں شمار ہونے لگے۔ ۱۹۹۶ء کے انتخابات میں انھوں نے چترال کی قومی اسمبلی کی نشست سے کامیابی حاصل کی اور اس طرح وہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ تقریباً تین سال تک وہ قومی اسمبلی کے ممبر رہے۔ اس دوران انھوں نے انتہائی جرأت، بصیرت اور بے باکی کے ساتھ اس طرح قومی مسائل، ملی تقاضوں اور عوامی امنگوں کی ترجمانی کی کہ وہ بہت جلد ایک ماہر اور دیدہ ور پارلیمنٹرین کی حیثیت اختیار کر گئے۔

مولانا عبدالرحیم چترالیؒ کا علم و فضل کے اعتبار سے ملک کے ممتاز علماء میں شمار ہوتا تھا۔ وہ جمعیت اتحاد العلماء پاکستان کی مرکزی مجلس مشاورت کے رکن بھی تھے۔

اُنھوں نے جہاد افغانستان میں مختلف انداز سے بھرپور شرکت کی۔ ان کے بہت سے تلامذہ نے بھی جہاد میں شرکت کی۔ ان میں سے بہت سے شہید بھی ہوئے۔ افغانستان کی جہادی قیادت میں کئی ایک نامور قائد ین اُن کے شاگرد تھے۔

اسلامک مشن کی دعوت پر وہ ۲۲ اگست ۱۹۹۶ء کو برطانیہ تشریف لے گئے۔ مانچسٹر، برمنگھم، ہل، گلاسکو اور لندن میں انھوں نے مختلف النوع اجتماعات سے عربی اور اردو میں خطاب فرمایا۔ اسی دوران میں ان کی صحت خراب ہو گئی۔ انھوں نے اپنے میزبانوں کے بے حد اصرار کے باوجود علاج کرانے سے انکار کر دیا اور 22 ستمبر ۱۹۹۶ء کو وطن واپس لوٹے۔ واپسی کے بعد ۵۶ دنوں تک مختلف ہسپتالوں میں زیر علاج رہنے کے بعد ۱۷ نومبر ۱۹۹۶ء کو پشاور میں انتقال کر گئے۔

مفتی یوسف صاحب: درس نظامی میں تبدیلی کی ضرورت

میری رائے میں درسِ نظامی میں جو علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں وہ ایک حد تک کافی ہیں لیکن کہیں کہیں ترمیم واضافے کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً تاریخ اور سیرت کے مضامین کو شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات ہمیں جغرافیہ کے مسائل معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے...... مثلاً مختلف مقامات پر نمازوں اور سحر وافطار کے اوقات کا یا رویتِ ہلال کا مسئلہ، لیکن اس کے لیے جغرافیہ کو نصاب میں شامل کرنا ضروری نہیں ہے، علماءِ کرام علمِ جغرافیہ کی کُتب کا مطالعہ الگ سے بھی کر سکتے ہیں۔

میرے خیال میں موجودہ درسِ نظامی کے نصاب کو بنیادی طور پر قائم رکھتے ہوئے بھی طلبہ میں جدید مسائل کا شعور پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میں ضبطِ تولید سے متعلق روایات واحادیث پڑھاتے ہوئے موجودہ زمانے کی تحریکِ ضبطِ ولادت پر بھی بحث کرتا ہوں۔ اسی طرح دوسرے بھی کئی جدید مسائل بقدرِ ضرورت زیرِ بحث لاتا رہتا ہوں۔

لیکن درسِ نظامی کے نصاب کی بعض کُتب تو ایسی ہیں جنہیں فوراً خارج کر دینا چاہیے مثلاً ادب کی کتاب نفحۃ الیمن کو، جس میں مخربِ اخلاق قصے ہیں، فوراً نکال دینا چاہیے۔ اسی طرح معلقات سبعہ جو جاہلیت کے زمانے کی چیز ہے اور اخلاق باختگی کا درس دیتی ہے، بھی فوراً خارج کر دینا چاہیے۔

پھر اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ طلبہ میں عربی کی استعداد پیدا کرنے کے لیے عربی زبان کے نصاب میں تبدیلی کی جائے۔ اس وقت صورت یہ ہے طلبہ تو در کنار، خود اساتذہ میں جو جید علماء ہیں نہ عربی بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ نظامِ تعلیم کی خرابی ہے۔ عربی ادب کی ایسی کُتب نصاب میں شامل ہیں جن میں سہل اور روزمرہ عربی کے خلاف دقیق عربی ہوتی ہے۔ مقامات اور متنبّی جیسی کُتب پڑھ کر ظاہر ہے کہ عربی بولنا اور لکھنا تو نہایت مشکل ہے۔ عربی بول چال اور زبان دانی کے لیے الگ سے کُتب شاملِ نصاب ہونا چاہئیں .... ایسی کُتب جو جدید عربی سے بھی واقفیت پیدا کریں اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ عربی

انقلاب ہمیشہ مدارس کے علماء ہی کے ہاتھوں آئے ہیں۔کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے ہاتھوں اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا۔

زبان جدید طریق کے مطابق پڑھائی جائے اور طلبہ کو انشا پردازی کی مشق کرائی جائے اور بول چال کی ترغیب دی جائے۔مثلاً یہ پابندی لگائی جا سکتی ہے کہ طلبہ مدرسہ کے اندر صرف عربی ہی میں آپس میں بات چیت کریں۔

مدارس عربیہ اور اسلامی انقلاب

اسلامی انقلاب کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ وہ ان اداروں سے باہر آ ہی نہیں سکتا۔اسلامی انقلاب کے لیے ابتدائی شرط یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو سمجھا جائے اور ان تعلیمات کو پھر معاشرے میں پھیلایا جائے۔جو لوگ اسلامی تعلیمات سے پوری طرح واقف نہ ہوں، ظاہر ہے وہ اسلامی انقلاب کے نقیب بھی نہیں بن سکتے۔اس وقت ملک کے تعلیمی اداروں میں طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد اسلامی انقلاب کے لیے کوشاں ہے مگر ان کا مسئلہ یہ ہے کہ ان میں جذبے کی تو شدت موجود ہے لیکن علم کی کمی ہے۔اگر دینی مدارس کے طلبہ میں، جو دین کا علم رکھتے ہیں، جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو یہ لوگ اسلامی انقلاب لا سکتے ہیں۔اس سے قبل بھی، ہماری تاریخ گواہ ہے کہ انقلاب ہمیشہ مدارس کے علماء ہی کے ہاتھوں آئے ہیں۔کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے ہاتھوں اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا۔ایک تدریجی اسلامی انقلاب کے چار مراحل ہیں:

۱۔علم ۲۔عمل

۳۔تبلیغ ۴۔نفاذ

میرا یقین کہ انقلاب صحیح علم کے بغیر نہیں لایا جا سکتا اور علم دین صرف دینی مدارس ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ دور کے مدارس کے طلبہ اور علماء میں جس چیز کی کمی ہے وہ ہے جذبۂ عمل۔ یہ لوگ میدانِ عمل میں بہت پیچھے ہیں۔ اگر ان میں عمل کا جذبہ پیدا ہو جائے تو اسلامی انقلاب کا راستہ کوئی نہیں روک سکے گا۔

مولانا عبدالرحیم صاحب

میں بصد احترام حضرت مفتی صاحب سے اختلاف کروں گا۔ میرے نزدیک دینی مدارس کے بجائے عام تعلیمی ادارے اسلامی انقلاب لانے کے زیادہ اہل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے وہ طلبہ جو مولانا مودودی کے خیالات سے متاثر ہو کر میدانِ عمل میں مصروفِ کار ہیں، اسلامی انقلاب کے نقیب بنیں گے۔ اس جدوجہد میں مدارس کے علماء تعاون کی حد تک تو شریک ہوں گے لیکن یہ علماء اسلامی انقلاب کی جدوجہد میں سربراہ نہیں بن سکتے۔ ان کی حیثیت مقتدی کی سی ہوگی۔ اسلامی انقلاب کو موجودہ دور میں برپا کرنے کی راہ میں مشکلات اور جو مطالبات درپیش ہیں انہیں صرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی سمجھ سکتا ہے۔

جہاں تک جناب مفتی صاحب کی اس بات کا تعلق ہے کہ اسلامی انقلاب کے لیے ابتدائی شرط علم ہے تو میرا خیال ہے کہ اسلامی انقلاب کی جدوجہد کرنے کے لیے کسی بڑے علم کی ضرورت نہیں بلکہ جذبۂ عمل کی ضرورت ہے اور یہ جذبۂ عمل مدارس کے طلبہ اور علماء میں مفقود ہے۔ اسلامی انقلاب کے لیے جتنے علم کی ضرورت ہے اتنا علم یونیورسٹیوں کے طلبہ مولانا مودودی صاحب کی کتب کی معرفت سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اسلام کی مبادیات ہی سے واقفیت کافی ہے اور یہ ضرورت مولانا مودودی کی کتب سے پوری ہو سکتی ہے۔

مولانا مودودی کے علاوہ جماعت اسلامی میں کوئی دوسرا لیڈر ایسا نہیں کہ جس کا علم لوگوں کو متاثر کر سکے۔

اصل بات یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے طلبہ اسلام کی خاطر اپنی جانیں لڑانے کا عزم رکھتے ہیں۔

جہاں تک مدارس کا تعلق ہے تو مودودی صاحب کی کتابوں سے قطع نظر، ہمارے علماء جو کتابیں پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، ان سے اُن کے ذہن میں اسلام کے نظامِ حیات کا کوئی تصور نہیں اُبھرتا۔ یہ تصور صرف مولانا مودودی کی فکر میں ہے۔

مفتی محمد یوسف صاحب

میں خود بھی مولانا مودودی کو انقلابی اسلامی لیڈر سمجھتا ہوں لیکن مولانا مودودی نے ذہن، فکر اور اعمال میں جو تبدیلی پیدا کی ہے، وہ بھی محض علم کی بدولت ہے۔ مولانا نے جدید دور کے تمام مسائل کا حل قرآن اور سنت کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ مولانا کے علاوہ جماعت اسلامی میں کوئی دوسرا لیڈر ایسا نہیں کہ جس کا علم لوگوں کو متاثر کر سکے البتہ جماعت کے دوسرے لیڈر اور کارکن اخلاص، اخلاق اور جذبۂ عمل کے اعتبار سے عام لوگوں سے بہت بہتر ہیں۔ لیکن میں خود مولانا مودودی کے علمی کارنامے سے متاثر ہوا ہوں۔ میرا یقین کہ انقلاب صحیح علم کے بغیر نہیں لایا جا سکتا اور علم دین صرف دینی مدارس ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سبھی بڑے بڑے علماءِ دین دینی مدارس ہی سے نکلے ہیں۔ مولانا مودودی کو البتہ اس سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔

مولانا عبدالرحیم صاحب

آپ نے بڑے بڑے علماء کا ذکر کیا ہے تو مجھے یہ کہنے دیجئے کہ مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا حسین احمد مدنی

اگر دونوں نظامِ تعلیم یکجا کر دیئے جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ تو علوم دین کے ماہر پیدا ہو سکیں گے اور نہ ہی دنیوی اور مادی علوم کے ماہر نکل سکیں گے۔

صاحب علماء اور محقق تو ضرور تھے لیکن دین کا وہ تصور جو انبیاء نے پیش کیا ہے؟ اس میں انہوں نے کوتاہی کی ہے۔

مفتی محمد یوسف صاحب

اگر دینی مدارس کے نصاب میں بنیادی تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں اور مدارس کے طلبہ کو سیاست، معاشیات اور تمدن اور جدید فلسفہ کے نظریات سے واقف کرایا جائے تو ایسے علماء پیدا ہو سکتے ہیں جو جدید دور میں اسلامی انقلاب کے نقیب اور علمبردار بن سکیں۔ گویا نصاب اور نظامِ تعلیم کی تبدیلی سے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔

سوال: تو کیا اس سے یہ مراد لی جائے کہ آپ مدارس کے نظامِ تعلیم اور کالجوں اور یونیورسٹی کے نظامِ تعلیم کو یکجا کرنے کے حق میں ہیں۔

مفتی یوسف صاحب

اگر دونوں نظامِ تعلیم یکجا کر دیئے جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ تو علوم دین کے ماہر پیدا ہو سکیں گے اور نہ ہی دنیوی اور مادی علوم کے ماہر نکل سکیں گے۔ دینی علوم کی طرف توجہ یقیناً کم ہو جائے گی۔ میری تجویز یہ ہے کہ دونوں نظامِ تعلیم الگ الگ چلیں لیکن عام تعلیمی اداروں میں علم دین کو بھی پوری طرح شامل کر لیا جائے۔ اساتذہ بھی اچھے اسلامی اخلاق کے حامل ہوں اور جدید علوم کی تعلیم میں اسلامی عنصر غالب رکھا جائے۔ دوسری طرف دینی مدارس میں جدید علوم کو بھی شامل نصاب کر لیا جائے۔

دین کا حقیقی فہم بھی صرف اُن لوگوں کو ہوتا ہے جو جدید علوم
سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔

مولانا عبدالرحیم صاحب

دراصل اسلامی نظام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کالجوں اور یونیورسٹیوں کا وہ نظامِ تعلیم ہے جو لادینیت پر مشتمل ہے۔ اسلامی تعلیمات کا بہت معمولی سا حصہ برائے نام شامل ہے اور بالعموم کفر، الحاد اور بے دینی کے عناصر غالب ہیں۔ دوسری طرف ہمارے دینی مدارس میں دین کا اصل تصور مفقود ہے اور سوائے ان علماء کے جو مولانا مودودی کے افکار سے متفق ہیں اکثر علماء محقق، شیخ القرآن اور شیخ الحدیث تو ضرور ہیں مگر نہ تو وہ اسلام کی اصل روح کو سمجھتے ہیں اور نہ آج کل کے زمانہ کے فتنوں سے آگاہ ہیں۔ چنانچہ ان میں ان فتنوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں۔ یہ علماء باطل نظریات کے دلائل سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ ان کا تصور اسلام محدود مذہب پر مبنی ہے۔

درس نظامی میں تبدیلی کی ضرورت

مولانا عبدالرحیم صاحب

ہمارے ہاں اکثر مدارس میں طلبہ کی تعلیمی مدت منطق اور فلسفہ پڑھنے میں ضائع ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ منطق صرف قطبی یا مسلم تک پڑھائی جائے اور اس کے بعد کی کُتب متروک قرار دے دی جائیں۔ قدیم یونانی فلسفہ پر مبنی کُتبِ فلسفہ سب کی سب ساقط کر دی جائیں اور ان کی جگہ ماہرینِ تعلیم کی مرتب کردہ جدید فلسفہ پر ایک جامع نصابی کتاب تیار کرائی جائے جو عربی زبان میں ہو۔ اسی طرح علمِ کلام میں خیالی اور شرح عقائد

آج کل ہمارے علماء جو اختلافی مسائل پر تشدد اختیار کرتے ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ مدارس میں آتے ہی جس چیز سے آگاہ ہوئے تھے وہ یہی اختلافی مسائل تھے۔

جیسی کتب کو نکال دینا چاہیے اور اس کی بجائے

عقائد کی کوئی نئی کتاب شامل کی جانی چاہیے۔ میری تجویز یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی عبارتوں سے منتخب کردہ عقائد پر عمدہ نصابی کتب تیار کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح نفحۃ الیمن اور معلقات سبعہ کو بھی فوراً نکال دینا چاہیے۔

معاشی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں ایک جامع کتاب عربی زبان میں لکھی جائے جس میں جدید معاشی نظریات کا تعارف ہو اور سوشلزم، کمیونزم اور سرمایہ داری کا تنقیدی مطالعہ بھی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی معاشیات کے اصول وقواعد بھی اس میں شامل ہوں۔ سیاسیات میں تو مولانا مودودی کی کتاب اسلامی ریاست کو شامل کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس کا عربی ترجمہ کیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر منطق کی کتب کم کر دی جائیں اور فلسفہ کی کتب سرے سے ختم کر دی جائیں اور مخرب دماغ گرامر کی کتابیں بھی کم کر دی جائیں تو باقی ماندہ وقت میں قرآن اور حدیث پر مناسب زور دیا جاسکتا ہے۔

ہمارے مدارس میں جو طالب علم داخل ہوتا ہے تو اُس کے سامنے قدوری یا نور الایضاح رکھ دی جاتی ہے جو حنفی فقہ کی کتب ہیں۔ گویا مدارس میں تعلیم کی ابتداء ہی اختلافی مسائل سے ہوتی ہے اور حنفیت اُس کے دماغ میں اس طرح بیٹھ جاتی ہے گویا اصل اسلام یہی ہو۔

میری تجویز یہ ہے کہ ابتداء میں طالب علم کو اسلام کے بنیادی عقائد کی تعلیم دینی چاہیے جو قرآن کی منتخب آیات

اور منتخب احادیث کے ذریعے دی جائے تا کہ ابتداء ہی سے اصولِ دین سے آگاہی ہو جائے۔ آج کل ہمارے علماء جو اختلافی مسائل پر تشدد اختیار کرتے ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ مدارس میں آتے ہی جس چیز سے آگاہ ہوئے تھے وہ یہی اختلافی مسائل تھے۔ پھر علماء دین میں جو تقلید کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے...... جو بعض اوقات شرک سے جاملتا ہے وہ بھی اسی وجہ سے ہے۔ دیوبندی اور بریلوی مسلک کے مدارس کے فارغ التحصیل لوگوں کا اختلاف بھی اساتذہ کے تعصبات کی وجہ سے قائم ہے اور بڑھ رہا ہے۔ یہ بھی بڑوں کی اندھی تقلید کا نتیجہ ہے۔

....

ہم اپنے مدرسہ حدیقۃ الاسلام میں اس بات کا خاص اہتمام کر رہے ہیں کہ اساتذہ فروعی مسائل کی بجائے اصولی مسائل پر توجہ مرکوز کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اہلِ حدیث مسلک کے ایک مدرس کو اپنے ہاں رکھا ہوا ہے۔ باقی مدارس میں یہاں اہلِ حدیث مدرس کو کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ہم فروعی مسائل سے طلبہ کو آگاہ تو ضرور کراتے ہیں لیکن انہیں اصولی مسائل کے برابر اہمیت نہیں دیتے۔ پھر ہمارے اساتذہ مختلف علومِ دینیہ کا درس دیتے ہوئے جدید مسائل پر بھی بحث کرتے ہیں اور ان کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی تشریح کرتے ہیں اور اشکال دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں خود بھی حتی الوسع کوشش کرتا ہوں کہ پڑھاتے وقت جدید دور کے مسائل سے بھی طلبہ کو آگاہ کرتا رہوں۔

مولانا
چوھدری نذیر احمد

مہتمم جامع العلوم، ملتان

جون ۱۹۷۵ء

چودھری نذیر احمد (۲۱جون ۱۹۱۴ء، جمال پور، ضلع کرنال۔ ۲ستمبر ۱۹۷۶ء ملتان) سٹیٹ ھائی اسکول، سامانہ سے میٹرك، اورمھندرا کالج، پٹیالہ سے گریجوایشن کرنے کے بعد ۱۹۳۶ میں‌گورنمنٹ کالج لاھور سے ریاضی میں ایم ایس سی کی ڈگری لی۔ والد صاحب کے اصرار پر نائب تحصیل داری کا امتحان دیا اور ۱۹۳۸ء میں باقاعدہ تقرری ھوئی۔ان کے والد صاحب ایك با عمل دین دار شخص تھے، جن کی دینی تربیت کا ان پہ گھرا اثر تھا۔ اسی لیے وہ شروع ھی سے پابند صوم و صلوۃ تھے۔ سرکاری ڈیوٹی کے بعد فارغ وقت میں، مقامی سرکاری اسکول کے استاد سے عربی صرف و نحو اور زبان و ادب کی تعلیم لیتے، تاکہ قرآن کو براہ راست سمجھ کر پڑھ سکیں۔ اس پورے عرصے میں وہ مولانا اشرف علی تھانوی کی حمائل شریف اپنے ساتھ رکھتے، اور تدریسی اوقات میں زیر تصرف عربی لغت کے الفاظ کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ساتھ درج کرتے جاتے، یوں انھوں نے قرآنی عربی اور انگریزی کی ایك لغت تیار کر لی۔

۱۹۴۵ء کے اوائل میں حکیم محمد عبداللہ نے مولانا مودودی کی کتاب خطبات دی، جسے ایک روز میں پڑھ لیا، اور اس سے گھرا تاثر لینے کے نتیجے میں اگلے روز مولانا مودودی کی تمام کتب فراہم کرنے کے لیے آرڈر دے دیا۔ کتب کے مطالعے سے ان پر واضح ہوا کہ طاغوت اور کفر کی ملازمت ترک کر دینی چاھیے۔ اس معاملے میں یکسوئی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید حسین احمد مدنی کو خطوط لکھے۔ مفتی صاحب نے جواب نہ دیا، مولانا آزاد نے ملازمت برقرار رکھنے کی رائے دی، جبکہ مولانا مدنی نے جواب دیا ملازمت ترک کردینی چاھیے۔ یوں انھوں نے مولانا مودودی اور مولانا مدنی کی رائے پر عمل کرتے ہوئے ۱۹٤٥ء میں نائب تحصیل داری سے استعفیٰ دے دیا۔غمِ روزگار سے نبٹنے کے لیے پھلے سرسہ میں ایک تجارتی ادارہ قائم کیا اور پھر ۱۹۴۷ میں ھجرت کرے پھلے دنیا پورجھانیاں اور بعد ازاں مستقل طور پر ملتان آباد ھو گئے۔

۱۹۵۱ء کے صوبائی انتخابات میں جماعت اسلامی کی طرف سے جھانیاں کی نشست پر انتخابات میں حصہ لیا۔ ۱۹۵۱ء میں انھیں روزنامہ تسنیم لاھور کا منیجر مقررکیا گیا۔ اسی عرصے میں جماعت اسلامی کے مرکزی نائب قیم اور پھر مرکزی ناظم مالیات کی ذمہ داریاں بھی ادا کیں۔ تاھم گھر کی معاشی ذمہ داریوں سے عھدہ برا ھونے کے لیے پرائیویٹ ٹیوشن شروع کی۔ اسی دوران میں مارچ ۱۹٥۳ء میں تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں گرفتاری کا سامنا کیا۔

۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے بعد جب جماعت اسلامی کی سرگرمیاں معطل ھو گئیں تو ملتان

میں ادارہ جامع العلوم کی بنیاد رکھی، جہاں دینی اور دنیوی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ یہ ادارہ ۱۹۶۴ء میں کالج کے درجے تک پہنچ گیا۔ جماعت اسلامی پر پابندی کے نتیجے میں جنوری ۱۹۶۴ میں دوسری بار گرفتاری ہوئی۔ ۱۹۶۵ء میں طالبات کے لیے مدرسہ تعلیم البنات کی بنیاد رکھی۔ اس طرح ۱۹۷۲ تک انھوں نے ٦ تعلیمی ادارے قائم کیے۔ چودھری صاحب بہ یک وقت طلبہ و طالبات میں دینی تعلیم و تربیت کے لیے نہ صرف فکر مند رہتے تھے، بلکہ عملی اقدام بھی کرتے تھے۔ انھی کے ایما پر، چودھری صاحب کی بڑی بیٹی شکورہ صاحبہ نے، اپنے گھر میں طالبات کو دعوت دے کر ستمبر ۱۹۶۹ء میں اسلامی جمعیت طالبات کی تاسیس کی۔

چودھری نذیر احمد خاں تعلیمی، رفاھی اور تربیتی کاموں کے ساتھ عملی سیاست میں بھی سرگرم کار رہے۔ جماعت اسلامی کی طرف سے دسمبر ۱۹۷۰ میں جھانیاں سے قومی اسمبلی کے الیکشن میں امیدوار بنے۔

س: مولانا، سب سے پہلے تو آپ اُس پرانے جامع العلوم کے بارے میں بتایئے جو اب سرکاری تحویل میں لیا جا چکا ہے، یہ جامع العلوم کب قائم ہوا اور کن مقاصد کے لیے قائم کیا گیا؟

ج: جامع العلوم ۱۹۵۵ء میں قائم ہوا۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہاں دو قسم کی درس گاہیں اس ملک میں پائی جاتی ہیں..... ایک تو دینی درس گاہیں ہیں جہاں صرف قرآن و حدیث اور دیگر عربی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے اور جہاں کے طلبہ جدید علوم سے بالکل ناواقف رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب دینی مدارس کے طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں تو معاشرے میں ان کی کھپت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ یا تو وہ اسی قسم کا مدرسہ کھول کر بیٹھ جائیں یا کسی جگہ امام یا خطیب یا مدرس کا کام کرنے لگیں۔ اس کے علاوہ نہ اُن کو معاشرے کے بارے میں کچھ معلومات ہوتی ہیں اور نہ اُن میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ تمدنی زندگی میں کھپ سکیں۔ اس کے برعکس جو ہمارے ہاں مروجہ سرکاری نظامِ تعلیم ہے، اس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ ابھی تک اُس مغربی فکر و فلسفہ پر قائم ہے جس پر انگریزوں نے یہاں اس کو قائم کیا تھا اس نظامِ تعلیم سے جو طلبہ نکلتے ہیں وہ اپنے اندر یہ صلاحیت تو رکھتے ہیں کہ موجودہ تمدنی نظام کے جملہ کاموں کو احسن طریق سے سرانجام دے سکیں لیکن اس نظامِ تعلیم کی بنیاد ساری کی ساری چونکہ مغربی فکر پر ہے، اس لیے یہ طلبہ نہ صرف یہ کہ اسلام کے موافق کوئی کام نہیں کر سکتے بلکہ اسلام کے خلاف کام کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام کے لیے ان کا وجود نقصان دہ ہوتا ہے۔

یہ بات نہایت افسوس ناک ہے کہ پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا مگر اسلام کے لیے ابھی تک یہاں کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ ہماری رائے میں پاکستان بننے کے بعد ہماری حکومت کو سب سے پہلا کام یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ نظامِ تعلیم کو بدلتی اور نظامِ تعلیم میں اُن تعلیمات اور اُن اصولوں کو سموتی جو اسلام نے ہمیں بتائے ہیں اور جن کی بنیاد پر یہ ملک قائم ہوا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ زمامِ کار اُن لوگوں کے

دین کا حقیقی فہم بھی صرف اُن لوگوں کو ہوتا ہے جو جدید
علوم سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔

ہاتھ میں رہی ہے جو خود مغربی فلسفہ وفکر پر ایمان رکھنے والے تھے۔ اس واسطے نہ یہ اُن کے بس میں تھا اور نہ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اس نظامِ تعلیم کو اچھے اسلامی اصولوں اور طریقوں کے مطابق ازسرِ نو مرتب کریں۔ لہٰذا ان درس گاہوں سے جو طلبہ نکلتے ہیں وہ صرف یک طرفہ..... یعنی دُنیوی اور جدید علوم جانتے ہیں اور اسلامی علوم سے ناواقف ہوتے ہیں۔

ہماری رائے یہ تھی کہ اگر اس ملک میں اسلامی نظام قائم کیا جا سکتا ہے تو یہ نظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں قائم ہوگا جو ایک طرف دینی علوم پر پورا عبور رکھتے ہوں اور دین سے پوری طرح واقف ہوں اور دوسری طرف وہ جدید علوم سے بھی پوری طرح آگاہ ہوں۔ کیونکہ اُنہوں نے اسلام کو آج سے پانچ سو برس پہلے کے دور میں نہیں بلکہ آج کے دور میں قائم کرنا ہے۔ پھر ہماری رائے یہ بھی تھی کہ دین کا حقیقی فہم بھی صرف اُن لوگوں کو ہوتا ہے جو جدید علوم سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ مثلاً اگر مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ معاشی نظام کو تبدیل کیا جائے تو اس تبدیلی کے لیے وہی لوگ کارآمد اور مفید ہو سکتے ہیں جو ایک طرف تو اسلام کے معاشی نظام کو بخوبی سمجھتے ہوں اور دوسری طرف اُن معاشی نظاموں پر بھی گہری نظر رکھتے ہوں جو اس وقت دُنیا میں رائج ہیں۔ صرف ایسے لوگ ہی یہ صلاحیت رکھتے ہیں تاکہ وہ اسلام کے معاشی نظام اور جدید معاشی نظاموں کا تقابلی مطالعہ کر کے، جدید معاشی نظاموں کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھال سکیں۔

چنانچہ یہ وہ مقاصد تھے جن کے پیشِ نظر مدرسہ جامع العلوم ۱۹۵۵ء میں قائم کیا گیا۔ اس مدرسہ کا آغاز تین

طالب علموں اور ایک استاد سے ہوا۔ جب کچھ عرصہ بعد طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا تو ہم نے ملتان شہر سے ایک میل دور کچھ زمین خریدی۔ ابتداء میں یہ زمین صرف چھ کنال تھی، اس کے بعد اس میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ ۲۳ کنال زمین مدرسہ کے لیے حاصل کر لی گئی۔

ابتداء میں ہم نے چھ سالہ نصاب تیار کیا جس میں دینی علوم اور جدید علوم ساتھ ساتھ جمع کیے گئے تھے۔ پیش نظر یہ تھا کہ طلبہ درسِ نظامی کا بھی نصاب پڑھ لیں اور میٹرک تک کا نصاب بھی پڑھ لیں۔ پھر جب طلبہ نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تو ہم نے نصاب کو ازسرِ نو مرتب کر کے اسے نو سالہ کر دیا۔ اس نصاب کی ترتیب یوں تھی کہ پرائمری پاس طلبہ کو داخل کیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ترمیم شدہ درسِ نظامی کا نصاب اور سرکاری اسکولوں کا نصاب شروع کرا دیا جاتا تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ آٹھویں جماعت میں طلبہ سرکاری مڈل کا امتحان دیتے تھے، نویں جماعت میں ادیب عربی کا امتحان، دسویں جماعت میں میٹرک کا امتحان، گیارہویں جماعت میں عالم عربی کا امتحان، بارہویں جماعت میں ایف۔ اے، تیرھویں جماعت میں فاضل عربی اور چودھویں جماعت میں بی۔ اے کا امتحان دلواتے تھے۔ اس طرح ان نو سالوں میں طالب علم گریجویٹ بھی ہو جاتا تھا اور فاضل عربی بھی (گویا دو سرکاری ڈگریاں اُسے حاصل ہو جاتی تھیں)، نیز اس کے ساتھ ساتھ وہ درسِ نظامی کا بھی ایک بڑا حصہ پڑھ چکا ہوتا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہمارے طالب علم میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی کہ جس طرح سرکاری کالجوں سے گریجوایٹ انگریزی کی کُتب پڑھ لیتے ہیں، اِسی طرح ہمارا گریجوایٹ عربی کی ہر کتاب کا مطالعہ کر سکتا تھا اور قرآن وحدیث کو براہِ راست پڑھ کر سمجھ سکتا تھا۔

جو سرکاری امتحانات ہم اپنے طلبہ سے دلواتے تھے، ابتداء میں تو پرائیویٹ طور پر دلواتے تھے مگر بعد میں طلبہ کی سہولت کے لیے ہم نے میٹرک تک ہائی اسکول کو Recognise کروا لیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انٹرمیڈیٹ کالج کو بھی Recognise کروالیا۔

ہمارا یہ تجربہ نہایت کامیابی سے چل رہا تھا کہ ۱۹۷۲ء میں جب حکومت نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو اپنی تحویل میں لینے کا اعلان کیا تو ہمارے یہ دونوں حصے.....یعنی ہائی اسکول اور کالج.....بھی سرکاری تحویل میں لے لیے گئے۔ سرکاری تحویل میں لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دینی نصاب جو ہم پڑھایا کرتے تھے وہ یک قلم منسوخ کر دیا گیا اور اُن کی مروجہ اسکیم میں جو جدید نصاب تھا وہ جاری رکھا گیا۔

اب ظاہر ہے کہ طلبہ جو جامع العلوم میں ایک خاص نوع کی تعلیم کے لیے ملک کے دور دراز حصوں سے آئے ہوئے تھے.....سرکاری تحویل میں لیتے وقت ہمارے ہاں ہائی اسکول میں کوئی ڈیڑھ سو طلبہ تھے اور کالج میں اسّی، یہ سارے کے سارے طالب علم، پاکستان کے دور دراز کے حصوں سے آئے ہوئے تھے اور ہوسٹل میں رہائش پذیر تھے..... یہ طلبہ جامع العلوم میں محض اس وجہ سے آئے تھے کہ یہ پاکستان بھر میں واحد ادارہ تھا جہاں جدید اور دینی تعلیم کا بیک وقت انتظام کیا گیا تھا، اب جبکہ انہوں نے یہ دیکھا کہ یہاں تعلیم تو یک طرفہ ہو کر رہ گئی ہے اور یہ یک طرفہ تعلیم تو وہ اپنے اپنے علاقوں اور شہروں میں بھی حاصل کر سکتے ہیں تو وہ یہاں سے چھوڑ کر چلے گئے۔ چنانچہ محکمۂ تعلیم کے مقامی افسران نے کالج بند کر دیا اور کالج کی عمارت کے کمرے اور دفاتر ہمیں واپس کر دیے۔ اسکول ابھی تک چل رہا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ گذشتہ سال یہاں صرف تین چار طالب علم تھے جبکہ اساتذہ کی تعداد ایک درجن سے بھی زائد تھی۔ ڈویژنل انسپکٹر آف ایجوکیشن معائنہ کے لیے آئے تو انہوں نے اساتذہ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے پرانی انتظامیہ (یعنی ہم سے) مل کر اسکول کو اُجاڑ دیا ہے۔ انہوں نے اساتذہ کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اسکول کے لیے طالب علم نہ جمع کیے تو وہ اساتذہ کی تنخواہیں بند کر دیں گے اور انہیں برخواست کر دیں گے۔ ورنہ Transfer تو ضرور کریں گے۔ اساتذہ اس بات سے ڈر گئے، انہوں نے اپنے طور پر کچھ رقم جمع کی، پرائمری اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں سے رابطہ قائم کیا اور اس طرح کوشش کر کے اس سال کوئی چالیس پچاس طالب علم مختلف کلاسوں میں جمع کر لیے۔ ہم نے

حکومت کو یہ درخواست دے رکھی ہے کہ اس اسکول کو جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس لیے اسے کسی قریبی سرکاری ہائی سکول میں merge کر دیا جائے اور جو سات آٹھ کمرے ہائی سکول کے قبضے میں ہیں وہ جامع العلوم کو واپس کر دیے جائیں۔

1972ء کے بعد ہم نے جو نیا نصاب مرتب کیا ہے وہ سات سال کا ہے۔ ہم پرائمری پاس طلبہ کو داخل کرتے ہیں اور سات سال میں اُنہیں درسِ نظامی کا نصاب اور اس کے ساتھ میٹرک تک کا نصاب پڑھانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس نئے نصاب کے تحت تین سال گزر چکے ہیں اور اب ہم چوتھے سال میں ہیں۔ انشاءاللہ ساتویں سال میں ہمارے طلبہ ایک طرف تو درسِ نظامی کے فارغ التحصیل ہو چکے ہوں گے اور دوسری طرف میٹرک کا امتحان بھی دے چکے ہوں گے۔

ہم نے نئے نصاب میں ایسا لٹریچر بھی رکھا ہے جو ایک طرف طلبہ کو دین کی مبادیات سے آگاہ کرتا ہے اور دوسری طرف جدید دنیا کے مسائل سے بھی روشناس کراتا ہے۔ ہمارے طلبہ ہوسٹل میں رہتے ہیں اور اس طرح ہمیں یہ موقع بھی مل جاتا ہے کہ ہم ان کی صحیح اخلاقی تربیت بھی کر سکیں۔

س: مولانا آپ نے فرمایا ہے کہ آپ کے پُرانے جامع العلوم میں اور اب نئے میں بھی درسِ نظامی کا نصاب طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے، کیا آپ کے ہاں پڑھایا جانے والا درسِ نظامی بھی بعینہٖ اُس شکل وصورت میں رائج ہے جو دوسرے دینی مدارس میں ہے یا آپ نے درسِ نظامی کا کوئی خاص حصہ لے لیا ہے اور باقی جو معاون علوم ہیں مثلاً منطق وفلسفہ وغیرہ، یہ چھوڑ دیے ہیں؟

ج: ہم نے منطق کا صرف ابتدائی حصہ رکھا تھا اور مشکل کتابیں حذف کر دی تھیں۔ عربی ادب میں بھی ہم نے نئی کتابیں شامل کر دی ہیں۔ ہم صرف ونحو پر زیادہ زور نہیں دیتے بلکہ عربی زبان کے روزمرہ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں تا کہ طلبہ عربی پڑھنے، بولنے اور لکھنے کے قابل ہو سکیں۔ اس کے علاوہ قرآن، حدیث، فقہ کا وہی نصاب

اب اس زمانہ میں کچھ اور قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں
جن کے لیے اب نئے علوم بھی قرآن وحدیث کو سمجھنے کے
لیے ضروری ہو جائیں گے۔

پڑھایا جاتا ہے جو درس نظامی میں رائج ہے۔اس میں ہم نے کوئی خاص تبدیلی نہیں کی۔البتہ دوسرے مدارس کا نصاب ذرا طویل ہے جبکہ ہم نے کچھ اختصار کر لیا ہے۔قرآن وتفسیر میں البتہ جلالین کے ساتھ ساتھ تفہیم القرآن (از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی) بھی ہم طلبہ کو پوری کی پوری پڑھا دیتے ہیں۔چنانچہ اس طرح ہمارے ہاں قرآن وحدیث پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جبکہ دوسرے دینی مدارس میں عربی صرف،نحو،منطق،فلسفہ اور فقہ پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ہماری ترتیب یہ ہے کہ ہم سب سے زیادہ زور قرآن پر دیتے ہیں،اس سے کم حدیث پر اور اس سے کم فقہ پر۔ان معمولی ترمیمات کے ساتھ ہمارے ہاں تقریباً وہی نصاب ہے جو اس وقت دوسرے دینی مدارس میں رائج ہے۔کچھ مضامین میں ہم نے کتابیں کم کر دی ہیں اور بعض میں بڑھا دی ہیں۔اُن کے ہاں سارا نصاب آٹھ سال میں ختم ہوتا ہے۔جبکہ ہمارے ہاں سات سال میں یہ سارا نصاب بھی ختم کرا دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی طلبہ کو میٹرک بھی کروا دیا جاتا ہے اور فاضل عربی کا امتحان بھی دلوایا جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک تو تعلیمی اوقات زیادہ ہیں اور دوسرے ہم محنت بھی زیادہ کراتے ہیں۔ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اوسط درجے کے ذہین طلبہ بآسانی یہ دونوں نصاب کامیابی سے مکمل کر سکتے ہیں۔

س: فلسفہ اور کلام بھی آپ کے ہاں نصاب میں شامل ہے؟

ج: دورِنو کے نصاب میں تو ابھی ان مضامین کا مرحلہ ہی نہیں آیا لیکن اس سے قبل یہ دونوں مضامین بھی

> ہم نے آج تک ایسا نہیں دیکھا کہ ایک مولوی صاحب پڑھ کر فارغ ہو چکے ہوں اور دنیاوی لحاظ سے مایوس پھر رہے ہوں اور بے روزگار ہوں۔

پڑھائے جاتے تھے تاہم ہم نے ان سے متعلق کُتب میں کمی کر دی تھی۔

س: اب آپ براہِ کرم یہ فرمائیے کہ قدیم اور جدید علوم کو یک جا کرنے کے بارے میں آپ کا تجربہ کیسا رہا؟ یہ سوال میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اگر دونوں طرح کے علوم کو یک جا کر دیا جائے تو دینی علوم کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے اور جدید دُنیوی علوم ہی اصل اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ طلبہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ انہیں جدید علوم کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے کیونکہ یہی علوم ان کے معاشی مستقبل کے لیے کارآمد ہوں گے۔ آپ کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ اس سلسلے میں کیا ہے؟

ج: میرا مشاہدہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ جو طلبہ ہمارے جامع العلوم سے فارغ ہو کر نکلے ہیں، اسلام اُن کی طبیعت میں ایسا رچ بس گیا ہے کہ وہ باہر جا کر اسلام کے خلاف کوئی کام کر ہی نہیں سکتے بلکہ وہ اسلام ہی کا کام کرتے ہیں۔ مجھے اُن لوگوں سے اتفاق نہیں ہے جو یہ کہتے ہیں کہ دونوں طرح کے علوم کو یکجا کرنے سے دینی علوم کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

یہ تو صرف اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب دین کی تعلیم صحیح طریقے سے نہ دی جائے۔ اگر دین کی پوری تعلیم دی جائے اور قرآن اور حدیث کی تعلیمات طلبہ کے ذہن میں پوری طرح ڈال دی جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ باہر نکلنے کے بعد اسلام کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے۔

ہمارے ہاں کی روایت یہ تھی کہ برصغیر پاک و ہند میں علماء
حکومت سے الگ تھلگ رہ کر آزاد ماحول میں پڑھتے
پڑھاتے تھے اور اس آزاد ماحول میں رہ کر آزاد رجحان رکھتے
تھے اور حکومت پر آزادانہ تنقید کرتے تھے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصل منشا تو صرف اُسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب جدید نصاب کو بھی اسلام کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا جائے۔ خرابی تو تب پیدا ہوتی ہے جب ایک طرف ہم دین کی کتابیں یا قرآن و حدیث پڑھاتے وقت طلبہ کو یہ بتائیں کہ اس کائنات کو ایک اللہ نے پیدا کیا ہے، وہی ہم سب کا خالق ہے اور اس نے ہماری رہنمائی کے لیے پیغمبروں کو بھیجا ہے، ہم اس کے خلیفہ اور نائب ہیں، اُس نے ہمیں ایک مکمل ضابطۂ حیات دیا ہے جس کے مطابق ہمیں یہاں زندگی بسر کرنا ہے اور دوسری طرف جب ہم اُنہیں جدید علوم پڑھائیں تو یہ پڑھانا شروع کر دیں کہ یہ کائنات محض اتفاقی طور پر وجود میں آ گئی ہے نہ خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اور نہ اُس نے ہمیں زندگی بسر کرنے کے لیے کوئی ضابطہ دیا ہے، تو ظاہر ہے کہ طلبہ کے ذہن میں ایک تضاد لازماً پیدا ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسلامی عقائد میں شک کرنے لگیں گے۔ جب اسلامی عقائد پوری یک سوئی کے ساتھ اُن کے ذہن میں نہیں اُتریں گے تو لازماً وہ دوسری طرف چلے جائیں گے اور اُن کی توجہ دین سے ہٹ جائے گی۔

ہمارے ہاں اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اسلامی لٹریچر کے ذریعے..... خصوصاً مولانا مودودی صاحب کی کتابوں کے ذریعے..... مغرب اور اہلِ مغرب کے فلسفوں پر تنقید کرتے ہیں اور طلبہ کو بتاتے ہیں کہ ان جدید علوم میں جو

یونیورسٹیوں کے طالب علم بعض خاص کتابیں یا اُن کے خلاصے یا ترجمے پڑھ کر امتحانات پاس کر لیتے ہیں۔ کسی خارجی مدد کے بغیر نہ تو کتابیں پڑھ سکتے ہیں اور نہ پڑھا سکتے ہیں۔

نظریات ملتے ہیں وہ ایسے لوگوں کے نظریات ہیں جو خدا اور رسولؐ پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ کہ ان کے نظریات درست نہیں ہیں۔ جہاں تک سائنسی اور بدیہی حقائق اور Facts کا تعلق ہے، وہ تو ٹھیک ہیں، لیکن ان حقائق کے ساتھ ساتھ اہلِ مغرب نے جو اپنے نظریات شامل کر دیئے ہیں کہ یہ کائنات اتنے ارب برسوں میں مکمل ہوئی یا خود بخود وجود میں آ گئی۔ یا یہ کہ انسان کسی کے سامنے جوابدہ نہیں، اِن کے بارے میں ہم طلبہ کو بتاتے ہیں کہ ان باتوں کی حیثیت محض نظریات کی سی ہے، یہ ثابت شدہ حقائق نہیں ہیں، لہٰذا ان باتوں پر توجہ نہ دی جائے۔
اگر ہم سارا نصاب اسلام کے نقطۂ نظر سے از سرِ نو مرتب کر لیں تو پھر جدید علوم اور دینی علوم کی تفریق بھی مٹ جائے گی اور سارا نصاب ایک ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر انگریزی کی کتابیں جو اس وقت اسکولوں اور کالجوں میں رائج ہیں، اُن میں مذہب اور اخلاق پر براہِ راست حملے کیے جاتے ہیں اور ایسا نقطۂ نظر بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مذہب اور اخلاق کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم انگریزی کی ایسی اضافی کتابیں مرتب کریں جو اسلامی جذبے اور اخلاقی داعیہ کو ابھارنے والی ہوں۔ اسی طرح مثلاً ریاضی جو اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے اُس میں ہم سود کی تعلیم دیتے ہیں، سود کے فائدے بتاتے ہیں اور یہ بات بیان کرتے ہیں کہ سود کے بغیر معاشی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نہایت بُرا اثر طلبہ کے ذہنوں پر پڑتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ریاضی کو بھی اسلام کے نقطۂ نظر سے مرتب کریں۔ اسی طرح سے معاشیات اور سیاسیات کے علوم کو بھی اسلام کے نقطۂ نظر سے از سرِ نو

مرتب کریں۔ جدید معاشرے اور سیاسی نظریات پر تنقید کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ صحیح معاشی اور سیاسی نظام تو وہی ہے جو اسلام نے دیا ہے۔ جدید معاشی اور سیاسی نظریات میں جتنے بھی پہلو گمراہی کے آئیں اُن کی نشاندہی کی جائے اور طلبہ کو بتایا جائے کہ یہ اُن لوگوں کے خیالات ہیں جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے ورنہ اصلی اور حقیقی نظریہ تو اسلام نے پیش کیا ہے اور اس کے مطابق ہی انسانی نظام چلایا جاسکتا ہے، یہی نظام انسان کے مسائل حل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس طریقے سے جب ہم جدید نظریات پر تنقید پیش کرتے ہیں تو وہ صورت پیدا نہیں ہوتی جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی یہ کہ طلبہ دُنیا کو ترجیح دینے لگیں اور دین کو چھوڑ دیں۔

س: مولانا، میں اب آپ سے اساتذہ کے بارے میں سوال کروں گا۔ پرانے جامع العلوم میں اساتذہ کی تعداد کتنی تھی؟ نیز یہ کہ انھیں کن بنیادوں پر آپ نے منتخب کیا تھا؟ کیا اساتذہ قدیم وجدید دونوں طرح کے علوم پر برابر نظر رکھنے والے لوگ تھے؟ یا صورت یہ تھی کہ قدیم علوم پڑھانے والے اساتذہ الگ تھے اور جدید علوم پڑھانے والے الگ؟

ج: پرانے جامع العلوم میں اساتذہ کی تعداد پندرہ تھی۔

مولانا خان محمد

سجادہ نشین و مہتمم خانقاہ و مدرسہ سراجیہ

کندیاں (میانوالی)

(نائب امیر، جمعیت العلمائے اسلام مفتی محمود گروپ)

۲۔ مارچ ۱۹۷۵ء

مولانا خان محمد ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ ۱۹۵۶ء سے وفات تک خانقاہ سراجیہ کندیاں، میانوالی کے سجادہ نشین رہے۔مولانا خان محمد نے ابتدائی تعلیم خانقاہ سراجیہ اور دارالعلوم عزیزیہ بھیرہ میں حاصل کی۔ حدیث کی کتب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں پڑھیں۔ ۱۹۴۱ء میں دارالعلوم دیوبند سے حدیث اور تفسیر کی تعلیم کی تکمیل کے بعد خانقاہ سراجیہ میں مقیم ہو گئے اور وفات تک خانقاہ کے سجادہ نشین رہے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت میں حصہ لیا اور گرفتار بھی ہوئے۔ ایک درجن سے زائد مدارسِ عربیہ کی سرپرستی اور معاونت کی۔ ۱۹۷۴ء کی ختم نبوت تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور ۱۹۷۷ء میں مولانا یوسف بنوری کی وفات کے بعد عالمی مجلسِ ختم نبوت کے امیر منتخب ہوئے۔ آپ کا انتقال ۵ مئی ۲۰۱۰ء کو ۹۰ سال کی عمر میں ہوا۔

ہمارے ہاں مدارس میں اس وقت تک جو نظامِ تعلیم چلا آ رہا ہے، اس سے ہم کافی حد تک مطمئن ہیں۔ البتہ موجودہ روش کے اعتبار سے تھوڑا بہت تغیر ہم چاہتے ہیں۔

ہمارے مدارس میں لکھنے اور بولنے کا نظام نہیں ہے۔ اس طرف اب ضروری توجہ دینے کا کام ہونا چاہیے۔ جس طرح اسکولوں میں لکھنے اور بولنے کا نظام ہے اور جو زبان بھی وہاں پڑھائی جاتی ہے اُسے وہ لکھاتے بھی ہیں اور اس کی مشق بھی کرائی جاتی ہے، اسی طرح کی صورت ہمارے مدارس میں نہیں ہے۔ ہمارے مدارس میں اس کی ابتداء ہی سے کمی ہے۔ لکھنے اور بولنے کی طرف توجہ نہیں ہے۔ صرف کتاب دانی کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ قرآن، حدیث اور دیگر علوم وفنون میں بھی صرف کتاب دانی پر زور دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ بولنے، پڑھنے اور لکھنے پر توجہ نہیں دی جاتی۔ ہم صرف یہی کمی محسوس کرتے ہیں۔

س: کیا آپ اس بات کی بھی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ مدارس کے نظامِ تعلیم میں قدیم عربی و دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کو بھی شامل کیا جائے؟ کیا یہ جدّت آپ کے نزدیک مناسب یا ضروری ہے؟

ج: یہ جدت تو ضرور ہونی چاہیے۔ زمانے کے تغیرات کے لحاظ سے یہ تو ہونا ہی چاہیے۔

س: یعنی آپ اس بات کے حق میں ہیں کہ جدید علوم مثلاً سیاسیات، عمرانیات، معاشیات اور انگریزی زبان بھی مدارس میں پڑھائے جائیں؟

ج: ان مضامین کو ضمنی حیثیت دینی چاہیے۔ اصل اور بنیادی اہمیت تو قرآن وحدیث ہی کو حاصل ہے۔ ان کے علاوہ جو فنون وعلوم درسِ نظامی میں شامل ہیں وہ ہمارے علماء نے قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے بطور معاون شامل کیے تھے۔ ان کو پڑھنے کا بالذات کوئی علیحدہ مقصد نہیں تھا۔ یونانیوں کے اثرات کی وجہ سے اُس زمانے میں بعض ایسی اصطلاحات رائج ہوگئی تھیں جو نئی تھیں، ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ان علوم وفنون کو پڑھنے کی ضرورت پیش آئی تو انہیں مدارس کے نصاب میں شامل کرلیا گیا۔ تو اب

> اب اس زمانہ میں کچھ اور قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں جن کے لیے اب نئے علوم بھی قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہو جائیں گے۔

اس زمانہ میں کچھ اور قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں جن کے لیے اب نئے علوم بھی قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہو جائیں گے۔ مثلاً جو سیاسی اور معاشی مسائل اس زمانے میں پیدا ہو گئے ہیں وہ پہلے زمانے میں نہیں تھے، ان کو سمجھنے کے لیے اور قرآن وحدیث میں ان کے متعلق غور وفکر کرنے کے لیے، ان علوم کو پڑھنا ضروری ہو گیا ہے۔

س: آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ہمارے معاشرے میں مادی آسائشیں حاصل کرنے کی ایک رو چلی ہوئی ہے اور مادی آسائشیں حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں دنیاوی معاملات میں کام آنے والی تعلیم حاصل کی جائے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کو نظر انداز کر کے دینی تعلیم حاصل کرتے رہیں اور اس تعلیم سے ظاہر ہے اُنہیں اتنا دنیاوی فائدہ حاصل نہیں ہوتا جتنا کہ عام تعلیم سے ہو سکتا ہے۔ نہ یہ لوگ سول سروس میں جا سکتے ہیں اور نہ ہی دوسری اچھی قسم کی پرائیویٹ ملازمتوں میں۔ کیا آپ بتا سکیں گے کہ ایک ایسے ماحول میں جبکہ مادیت پسندی کا رجحان عام ہے، بعض لوگ یہ کیوں فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ دینی مدارس میں تعلیم حاصل کریں۔

ج: یہ خیال کرنا غلط ہے کہ دینی مدارس میں جو لوگ پڑھتے ہیں وہ کوئی نمایاں قسم کے لوگ نہیں ہوتے یا اُن کا معاشی مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ دراصل جس نظام میں یہ لوگ چل رہے ہیں اس نظام کی بقا کی بھی تو

ہم نے آج تک ایسا نہیں دیکھا کہ ایک مولوی صاحب پڑھ کر فارغ ہو چکے ہوں اور دنیاوی لحاظ سے مایوس پھر رہے ہوں اور بے روزگار ہوں۔

ضرورت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ نظام اس وقت ہی باقی رہے گا جب اس کو چلانے والے بھی پیدا ہوتے رہیں۔ اگر ہمیں دینی مدارس کو چلانا اور انہیں باقی رکھنا ہے تو ان مدارس کے مہتمم حضرات کی بھی ضرورت ہوگی، اساتذہ کی بھی ضرورت ہوگی۔ پھر اس نظام کے ساتھ مساجد کا بھی نظام ہے جہاں آئمہ اور خطباء کی بھی ضرورت ہوگی۔ تو ان لوگوں کے لیے جو مدارس میں پڑھتے ہیں، اس طرح کے دنیاوی راستے بھی کھلے ہوتے ہیں۔ ہم نے آج تک ایسا نہیں دیکھا کہ ایک مولوی صاحب پڑھ کر فارغ ہو چکے ہوں اور دنیاوی لحاظ سے مایوس پھر رہے ہوں اور بے روزگار ہوں۔ اگر کسی نے صحیح طریقہ سے پڑھ رکھا ہے تو وہ کبھی بھی بے کار نہیں رہے گا۔ مدارس میں مدرسین کی اس قدر قلّت ہے کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اچھے مدرسین نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ہاں کے کئی مدارس ٹھیک طریقے سے نہیں چل رہے ہیں۔ اگر طلبہ صحیح طریقہ سے پڑھیں تو مدارس میں اساتذہ کی یہ قلت بھی پوری ہو سکتی ہے۔ اس وقت مدارس میں صدر مدرسین پانچ سو سے سات سو روپے ماہوار تک تنخواہ لے رہے ہیں جو ایک اوسط درجے کے خاندان کے لیے ایک معقول آمدنی ہے۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دینی مدارس میں پڑھنے والوں کا معاشی مستقبل تاریک نہیں ہے اُن کے اپنے میدان میں اُن کے لیے راستے کھلے ہیں۔

س: کیا یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل جنھوں نے ایم۔اے (عربی) یا ایم۔اے (اسلامیات) کیا ہو،

ہمارے ہاں کی روایت یہ تھی کہ برصغیر پاک و ہند میں علماء حکومت سے الگ تھلگ رہ کر آزاد ماحول میں پڑھتے پڑھاتے تھے اور اس آزاد ماحول میں رہ کر آزاد رجحان رکھتے تھے اور حکومت پر آزادانہ تنقید کرتے تھے۔

دینی مدارس میں مدرس نہیں بن سکتے؟

ج: یہ لوگ ہمارے مدارس میں کام نہیں کر سکتے۔ یونیورسٹیوں کے طالب علم بعض خاص کتابیں یا اُن کے خلاصے یا ترجمے پڑھ کر امتحانات پاس کر لیتے ہیں۔ کسی خارجی مدد کے بغیر نہ تو کتابیں پڑھ سکتے ہیں اور نہ پڑھا سکتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی عربی لکھنے اور بولنے کی کمی ہے...... بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ ہمارے ہاں۔ ان کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ امتحانی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

س: بعض مدارس میں طلبہ کے آزادانہ معاشی مستقبل کے لیے اُن کو کچھ فنون بھی سکھائے جاتے ہیں مثلاً لکڑی کا کام، کتابت، طب، وغیرہ، اِس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: فن سیکھنے کے لحاظ سے تو یہ بات مناسب ہے۔ ہمارے پرانے علماء جتنے خوشنویس ہوتے تھے اتنے آج کے علماء نہیں ہیں۔ بہرحال پہلے زمانے میں مدارس میں یہ چیزیں بھی سکھائی جاتی تھیں مثلاً طب یونانی جو کہ ہر مدرسہ میں پڑھایا جاتا تھا اب پہلے کی نسبت یہ چیزیں کم ہوگئی ہیں۔

س: اس سلسلہ میں ایک اور گنجائش بھی سامنے آ رہی ہے۔ حکومت وزارتِ مذہبی امور اور محکمہ اوقات کی سرگرمیوں کو مزید وسعت دینا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس بات کا امکان بھی شائد پیدا ہو جائے کہ مدارس

یونیورسٹیوں کے طالب علم بعض خاص کتابیں یا اُن کے خلاصے یا ترجمے پڑھ کر امتحانات پاس کر لیتے ہیں۔ کسی خارجی مدد کے بغیر نہ تو کتابیں پڑھ سکتے ہیں اور نہ پڑھا سکتے ہیں۔

عربیہ سے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک تعداد ان محکموں میں ملازمت کر سکے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: اگر حکومت نیک نیتی سے کوئی کام کرے تب تو یہ ممکن ہے کہ کوئی بہتر نتائج پیدا ہوں لیکن اب تک جو حالات سامنے آئے ہیں، اُن کے پیش نظر کوئی اچھی توقع باندھنا مشکل ہے...... مثلاً جامعۂ اسلامیہ بہاولپور کو لیجیے جہاں تقریباً چار پانچ لاکھ روپیہ سالانہ خرچ ہو رہا ہے مگر وہاں صرف ساٹھ ستر طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ بظاہر اب تک حکومت اس سلسلہ میں کوئی کامیاب اسکیم نہیں بنا سکی ہے۔ اسی طرح محکمۂ اوقاف نے جن مساجد کو اپنی تحویل میں لیا ہے وہاں بھی صحیح طریقہ سے کام نہیں چل رہا۔ اوقاف کے سارے علماء بے حد مایوس ہیں۔

دراصل حکومت نے محکمۂ اوقاف اپنی سیاسی مصلحت کے لیے بنایا تھا۔ ہمارے ہاں کی روایت یہ تھی کہ برصغیر پاک و ہند میں علماء حکومت سے الگ تھلگ رہ کر آزاد ماحول میں پڑھتے پڑھاتے تھے اور اس آزاد ماحول میں رہ کر آزاد رجحان رکھتے تھے اور حکومت پر آزادانہ تنقید کرتے تھے۔ چنانچہ اس بات کا سدباب کرنے کے لیے خصوصاً ایوب خان کے زمانے میں یہ اسکیم بنائی گئی کہ مساجد، مدارس اور مقابر پر قبضہ کیا جائے۔ ایوب خان کی یہ اسکیم آج بھی چل رہی ہے۔ سرکاری دفاتر میں تو پرانی اسکیم محفوظ ہے۔

چنانچہ موجودہ حکمرانوں کے سامنے بھی اس طرح کی تجاویز آ جاتی ہیں اور یہ لوگ اس سلسلہ میں اپنے پیشروؤں سے کچھ زیادہ ہی تیز ہیں۔ اگر مخلوقِ خدا کے فائدہ کے لیے کام کرنا چاہیں تو اس محکمہ سے بہت سے مفید کام لیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً وقف املاک کا انتظام، اسلام کی تبلیغ، اسلامی کُتب کی اشاعت، جیسا کہ شیخ محمد اکرام صاحب کے زمانے میں خاصی بڑی تعداد میں اسلامی کُتب شائع کی گئی تھیں۔

ہم نے کویت میں محکمۂ اوقاف دیکھا ہے۔ وہاں انہوں نے بہت سی اسلامی کُتب چھاپی ہیں۔ اسی طرح آئمہ مساجد کا بھی انہوں نے انتظام کر رکھا ہے۔ نجی طور پر مسجد بنانے کی تو ہر شخص کو اجازت ہے لیکن مسجد بننے کے بعد اُس شخص کو مسجد پر کوئی تصرف نہیں رہتا اور مسجد حکومت کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ ہر مسجد میں تین ملازم ہوتے ہیں: امام، مؤذن اور خادم۔ جس مسجد میں جمعہ ہوتا ہے وہاں خطیب بھی رکھا جاتا ہے لیکن حکومت ان کے کسی مسئلہ میں مداخلت نہیں کرتی۔ صرف یہ چاہتی ہے کہ پانچوں وقت امام مسجد میں حاضر رہے اور باقاعدہ نماز پڑھاتے رہیں۔

س: یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ حکومت کی طرف سے اجتماعات جمعہ میں دیئے جانے والے خطبات مرتب کر کے خطیب حضرات کو دیئے جائیں گے تاکہ تمام مساجد میں مقررہ موضوعات پر خطبات دیئے جا سکیں۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: یہ بہت ہی ناقابلِ عمل چیز ہے۔ اگر حکومت زبردستی بھی کرے تو بھی اوقاف والے خطیب تک اس کی پابندی نہیں کریں گے جمعہ کے خطبے کے دو حصے ہیں: ایک تو ہے عربی میں پڑھا جانے والا جمعہ کا خطبہ، وہ تو شاید تمام مساجد میں ایک ہو سکتا ہے لیکن حکومت کی نظر میں جو اصل خرابی ہے وہ جمعہ سے پہلے کی تقریر ہے جو خطیب حضرات کرتے ہیں۔ مگر اسے ہر جگہ کے لیے مقرر کرنا ناقابلِ عمل ہے۔

مولانا
علی محمد مظاہری

مدرسہ عربیہ بلوخیل، میانوالی

(قیم جماعت اسلامی، میانوالی)

۲۔ مارچ ۱۹۷۵ء

مولانا علی محمدمظاہری مرحوم کے والد غلام حسین ترجاہ عیسیٰ خیل کے قریب عادل شاہ میں معمولی زمیندار تھے۔ مولانا علی محمد ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ خوشاب اور اٹک کے مدارس سے درس نظامی کی تعلیم حاصل کی۔ تقسیم ہند سے قبل مفتی زین العابدین لائل پور[فیصل آباد]، مولانا اقبال کلور شریف، خواجہ خان محمد خانقاہ سراجیہ اور مولانا علی محمد مظاہری دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے لیے گئے۔ مفتی زین العابدین اور مولانا اقبال کو دیوبند کے بجائے ڈھابیل جانا پڑا جبکہ مولانا علی محمد مظاہری اور خواجہ خان محمد صاحب نے دیو بند سے دورۂ حدیث کیا۔

تقسیم ہند سے قبل آپ مولانا اقبال کے پاس مسجد و مدرسہ میں رہے مگر جب ان سے اختلاف ہوا تو بلوخیل تحصیل کی مسجد میں امامت شروع کر دی اور ۱۹۵۲ء میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ قاسم العلوم بلوخیل قائم کیا۔ تحصیل کی یہ مسجد

۱۹۰۱ء میں تعمیر ہوئی تھی، اب اس سے ملحق تقریباً ۳ کنال میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ ۱۰ سال سے چل رہا ھے۔

مولانا علی محمد مظاہری ہر مسلک کے علماء سے وسیع تعلقات رکھتے تھے۔ مولانا عبدالستار نیازی مرحوم جب وزیر بنے تھے تو انھوں نے جامعہ اسلامیہ قاسم العلوم میں دو یا تین کمروں پر مشتمل بلاک تعمیر کرا کے دیا۔ مولانا علی محمد مظاہری ، حق نواز خان، مولانا گلزار احمد مظاہری اور مولانا غلام محمد مندہ خیل کی ٹیم نے ۱۹۷۰ء تک علاقے میں وسیع پیمانے پر جماعت اسلامی کا دعوتی کام کیا۔

۱۹۷۲ء میں مولانا علی محمد مظاہری جماعت اسلامی میانوالی کے امیر ضلع مقرر ہوئے۔ مولانا علی محمد مظاہری امارتِ ضلع کے بعد ۷ سال لکڑ وال فیکٹری کالونی کی بڑی جامع مسجد میں خطیب رہے۔ ۱۹۸۱ء میں پہلی بار تحصیلی نظم قائم ہوا تو تحصیل میانوالی کے مولانا علی محمد مظاہری امیر تحصیل مقرر ہوئے۔

۱۹۷۷ء کی قومی اتحاد کی تحریک میں بھکر اور میانوالی کے جلسوں میں مولانا علی محمد مظاہری کی خطابت کا مدتوں چرچا رہا۔ مولانا علی محمد مظاہری نے ۱۷ مئی ۱۹۹۹ء میں ۷۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

(ماخذ۔ "گلزارِ کوہ صحرا" مرتبہ مولانا محمد نعمانی پپلاں ضلع میانوالی، غیر مطبوعہ)

میرا خیال ہے کہ جس طرح ایک ڈاکٹر کو صرف ڈاکٹری کے علوم پڑھنے چاہئیں اور ایک جج یا وکیل کو صرف قانون پڑھنا چاہیے۔ اسی طریقے سے قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم کا بھی تخصیصی شعبہ ہونا چاہیے۔

درس نظامی کی موجودہ صورت حال

اس نظام کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ ہم بجائے اس کے کہ قرآن وسنت کو سمجھیں۔ یہ نظام ہمیں پرانی معقولات اور فلسفہ کی طرف لے جاتا ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اس نظام میں ادب کی جو کتابیں جاری کی گئی ہیں وہ بجائے فائدے کے نقصان دینے والی ہیں۔ نہ تو ان کتابوں کو پڑھ کر ہم ادیب بن سکتے ہیں اور نہ ہی یہ کتابیں ہمارے اندر کوئی اسلامی جذبہ پیدا کرتی ہیں۔

میرے خیال میں یہ نظامِ تعلیم اس طرح ہونا چاہیے کہ گرائمر، یعنی صرف ونحو پڑھنے کے بعد ہر طالب علم کو جدید عربی کی کتابیں پڑھائیں جائیں۔ وہ کتابیں جو مصر اور دیگر عرب ممالک کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں تاکہ طالب علم وہ عربی جان سکے جو اس دور میں رائج ہے۔ پھر وہ عربی لکھ بھی سکے گا، پڑھ سکے گا اور بول بھی سکے گا۔

نیز قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ طالب علم بلاواسطہ قرآن وحدیث کو پڑھ اور سمجھ سکے۔ یہ فلسفہ اور ادب سب خرافات ہیں، انہیں یکسر نصاب سے خارج کر دینا چاہیے۔

س: کیا درسِ نظامی کے ساتھ جدید علوم مثلاً معاشیات، سیاسیات اور انگریزی زبان کی تعلیم کو بھی شامل کرنا مناسب ہوگا؟

موجودہ دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس میں فنون سکھانے کے شعبے قائم کیے جائیں تاکہ طلبہ اپنے آزاد معاشی مستقبل کی تعمیر کر سکیں اور لوگوں کے محتاج ہو کر نہ رہ جائیں۔

ج: میرے اپنے تجربے کے مطابق درسِ نظامی کے نصاب میں انگریزی کا شامل کرنا نہایت خطرناک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب طالب علم کو درسِ نظامی کا نصاب اور انگریزی کی تعلیم ملا کر دی جاتی ہے تو طالب علم کی پوری توجہ انگریزی کی طرف ہو جاتی ہے، اس لیے کہ اس میں اُسے سرکاری امتحان دینا ہوتا ہے جبکہ درسِ نظامی کے علوم کا اُسے امتحان نہیں دینا پڑتا۔ اس طرح لڑکے انگریزی میں کامیابی کی کوشش کرتے ہیں اور اُن کی توجہ اصل مقصد سے ہٹ جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح ایک ڈاکٹر کو صرف ڈاکٹری کے علوم پڑھنے چاہئیں اور ایک جج یا وکیل کو صرف قانون پڑھنا چاہیے۔ اسی طریقے سے قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم کا بھی تخصیصی شعبہ ہونا چاہیے تاکہ ایسے لوگ بھی پیدا ہو سکیں جن کی نظر قرآن وحدیث اور فقہ پر اتنی وسیع ہو کہ وہ انہیں سمجھ سکیں اور دوسروں کو سمجھا سکیں۔

س: جدید دُنیا کے مسائل سے اسلام کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ مدارس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم بھی پڑھائیں جائیں؟

ج: میرے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ معاشیات اور موجودہ دور کے دوسرے ضروری علوم مدارس کے طلبہ کو عربی زبان میں پڑھائے جائیں بہ نسبت اس کے کہ اُنہیں انگریزی پڑھانے کے بعد یہ علوم انگریزی زبان میں پڑھائے جائیں۔

میں اس بات کا سخت مخالف ہوں کہ مدارس کے طلبہ کو ایک خاص قسم کا لباس پہنا کر اُنہیں اپنے ہم عمروں سے الگ تھلگ گروہ بنا دیا جائے اور انہیں اس بات کی ترغیب دی جائے کہ وہ مفلسانہ زندگی گزاریں اور درویشانہ طور طریقے اختیار کریں۔

انگریزی پڑھنے میں سب سے بڑی خرابی یہ دیکھی ہے کہ طالب علم پھر انگریزی ہی کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور قرآن وحدیث اور فقہ اور دیگر عربی علوم کی طرف اُن کی توجہ بہت کم رہ جاتی ہے۔ جو بات آپ نے کہی ہے وہ ہے تو ضروری اور میں سمجھتا ہوں کہ اب جدید علوم کے بغیر گزارہ بھی نہیں چلے گا۔ لیکن تجربے نے ثابت کیا ہے کہ دینی علوم اور جدید علوم کو اکٹھا کرنا کبھی مفید نہیں رہا۔

س: آپ دینی مدارس میں پڑھے ہیں اور آپ نے پڑھایا بھی ہے۔ کیا آپ براہِ کرم دینی مدارس کے ماحول اور تعلیمی فضا کے بارے میں اپنے مشاہدات بتائیں گے؟

ج: میرے زمانۂ طالب علمی میں طلبہ اور اساتذہ کے درمیان ادب اور احترام کی فضا پائی جاتی تھی۔ موجودہ دور میں یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ طلبہ کچھ بے باک ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر اپنے استادوں کا وہ احترام باقی نہیں رہا جو پہلے زمانے میں ہم نے دیکھا ہے۔

پھر یہ خرابی بھی پیدا ہو گئی ہے کہ طلبہ آزاد ہوتے جا رہے ہیں اور جو چیز حاصل کر رہے ہوتے ہیں، اس پر عمل نہیں کرتے۔ مثلاً اُن کا فرض تھا کہ نماز کی پابندی کرتے اور اسلامی اخلاقیات اُن کے اندر دوسروں کی نسبت زیادہ ہونا چاہیے تھیں، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کے اندر اس چیز کی کمی ہے۔

بعض مدارس ایسے بھی ہیں جہاں بچے پڑھنے کے لیے جاتے ہیں اور سال ہا سال تک وہ ان مدارس میں پڑے رہتے ہیں اور ان کو کچھ پڑھایا نہیں جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدارس کے مہتممین حضرات اور مدرسین کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ وہ روٹی کے چند ٹکڑوں کے عوض ان طلبہ سے اپنی خدمات کراتے رہتے ہیں، اپنے گھر کا کام کاج کراتے ہیں اور بہت کم پڑھاتے ہیں۔ میں اس عمل کو قتلِ انسان کے عمل سے تعبیر کرتا ہوں۔

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مدارس میں ان چیزوں کی طرف توجہ کم دی جا رہی ہے۔

س: کیا مدارس کے طلبہ میں آپ کے نزدیک یہ امکان پایا جاتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد میں کوئی مؤثر حصہ لے سکیں؟

ج: موجودہ مدارس کے طلبہ میں نہ اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ اس نظام کو چلانے کی۔

س: دینی مدارس کے طلبہ کا معاشی مستقبل کیا ہے؟

ج: جو طالب علم ذرا بہتر اور ہوشیار ہوتے ہیں وہ بڑے شہروں میں جا کر امام بن جاتے ہیں۔ جو ان سے بھی زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں وہ دورۂ حدیث کرنے کے بعد مولوی فاضل کر لیتے ہیں اور اس کے ذریعے بی۔ اے اور ایم۔ اے کر لیتے ہیں اور اس طرح اسکولوں اور کالجوں کی ملازمت حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کم ہی ہوتی ہے۔ درمیانے درجے کے طلبہ کسی چھوٹے سے شہر

مہتمم حضرات کو چاہیے کہ اگر وہ علم دین پڑھانا چاہتے ہیں تو صرف اتنے طالب علم اپنے مدارس میں رکھیں جن کی باعزت کفالت کا انتظام وہ کر سکیں۔ اس سے زیادہ طالب علموں کو رکھنا زیادتی ہے اور قوم کے بچوں کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔

یا گاؤں کی مسجد کے امام بن جاتے ہیں۔ اگر کوئی زیادہ قابل ہو تو وہ کسی مدرسے میں مدرس بن جاتا ہے۔ اگر تو اچھا مقرر اور خوش آواز ہو تو خطیب بن جاتا ہے۔ بس انہی تین چار شعبوں ہی سے ان لوگوں کو رزق ملنے کی اُمید ہوتی ہے۔

س: اب تو محکمۂ اوقاف اور وزارتِ مذہبی امور کے ذریعے ان طلبہ کے سرکاری ملازمت میں جانے کی گنجائش بھی پیدا ہو گئی ہے؟

ج: جی ہاں، بعض طلبہ ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر آزادی پیدا نہیں ہوتی اور ان کا مقصد بھی اس تعلیم سے صرف روٹی کمانا اور کھانا ہی ہوتا ہے، ان لوگوں کے لیے تو یہ موقع اچھا ہے۔ لیکن ایک گروہ ان طلبہ میں ایسا بھی ہے جو گورنمنٹ کی ملازمت کو اچھا نہیں سمجھتا کیونکہ وہ اپنے نظریات کو ختم کرنا نہیں چاہتا۔

س: طلبہ کے آزاد معاشی مستقبل کے لیے آپ کیا تجویز پیش کریں گے؟

ج: موجودہ دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس میں فنون سکھانے کے شعبے قائم کیے جائیں تاکہ طلبہ اپنے آزاد معاشی مستقبل کی تعمیر کر سکیں اور لوگوں کے محتاج ہو کر نہ رہ جائیں۔ اگرچہ اس کا ایک نقصان بھی ہے اور وہ یہ کہ دین پڑھنے والے طلبہ دُنیا کی طرف چلے جائیں گے اور ان کی تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان مدارس میں انسانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔

بہتر حل یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم میں صرف اُنہی طلبہ کو داخلہ دیا جائے جن کا رجحان درس و تدریس کا ہو۔ پھر جب یہ طلبہ مدارس سے فارغ ہوں تو اپنے خصوصی دلچسپی کے شعبوں مثلاً قرآن، حدیث یا فقہ، میں تحقیقی اور تدریسی کام کر سکیں۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر میرے نزدیک عربی اور دینی تعلیم کا کچھ فائدہ نہیں۔

س: عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عربی مدارس کے طلبہ اپنے لباس، اپنی گفتگو، چال ڈھال اور دیگر اطوار کے لحاظ سے اپنے ہم عمر دوسرے طالب علموں سے بہت مختلف ہوتے ہیں؟ کیا آپ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرنا پسند کریں گے؟

ج: میں اس بات کا سخت مخالف ہوں کہ مدارس کے طلبہ کو ایک خاص قسم کا لباس پہنا کر اُنہیں اپنے ہم عمروں سے الگ تھلگ گروہ بنا دیا جائے اور انہیں اس بات کی ترغیب دی جائے کہ وہ مفلسانہ زندگی گزاریں اور درویشانہ طور طریقے اختیار کریں۔ میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ مدارس کے طلبہ کو اچھے شہریوں کے سے انداز میں رہنے سہنے کی تلقین کی جائے۔ لباس، رہائش اور خوراک، غرض ہر معاملہ میں اُنہیں نفاست اور سلیقے سے رہنا سکھایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان مدارس میں انسانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ بعض مدارس ایسے بھی ہیں جہاں بچے پڑھنے کے لیے جاتے ہیں اور سال ہا سال تک وہ ان مدارس میں پڑے رہتے ہیں اور ان کو کچھ نہیں پڑھایا جاتا اس کی وجہ یہ ہے کہ مدارس کے مہتمین حضرات اور مدرسین کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے وُہ روٹی کے چند ٹکڑوں کے عوض ان طلبہ سے اپنی خدمت کراتے

رہتے ہیں اپنے گھر کے کام کاج کراتے ہیں اور بہت کام پڑھاتے ہیں۔ میں اس عمل کو قتل انسان عمل سے تعبیر کرتا ہوں۔

س: مدارس میں طلبہ کی معاشی کفالت کے انتظامات کے بارے میں آپ کے خیالات کیا ہیں؟

ج: دینی مدارس میں پہلے تو ایسا ہوتا تھا کہ طالب علم محلوں سے جو کچھ مانگ کر لاتے تھے، ان کی گزر اوقات اسی پر ہوتی تھی۔ اس میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ بڑے سے بڑا خوددار بھی بھکاری بن جاتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قوم کے بچوں کو بھیک کی عادت ڈالنا اُنہیں تباہ کرنا اور قتل کرنا ہے۔

پھر یہ ہے کہ اکثر مدارس میں ان طلبہ کو بھیڑ بکریوں کی طرح ایک تنگ سے کمرے یا مکان میں بند کر دیا جاتا ہے اور باہر کی دنیا کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ہم ان بچوں کو دین پڑھا رہے ہیں۔

میں اپنی مثال دیتا ہوں۔ میرے اپنے خاندان میں کوئی مولوی نہیں گزرا۔ تاہم مجھے دینی تعلیم کا شوق تھا اور میں ایک مدرسہ میں داخل ہو گیا جہاں میں نے تعلیم کی تکمیل لوگوں کے گھروں سے وظیفے مانگ کر کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے ذہن سے اُس برائی کے اثرات ابھی تک نہیں گئے، جس کی عادت مجھے بچپن میں ڈال دی گئی تھی...... باوجود یہ کہ میں جماعت اسلامی کا رُکن ہوں اور جماعتِ اسلامی میانوالی ضلع کا امیر بھی رہا ہوں، میرے ذہن میں اس بُرائی کے اثرات ابھی تک باقی ہیں...... اب بھی میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میں کسی دوسرے سے کوئی چیز لے لوں۔ اگرچہ میرا ضمیر اس کے خلاف مزاحمت کرتا ہے اور اس عادت کو بُرا جانتا ہے لیکن میرے اندر اب بھی ایک بھکاری چھپا ہوا ہے جو مجھے مجبور کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص مجھے کوئی چیز دے تو میں اُس سے لے لوں۔

یہ ہے وہ صورتِ حال جس کے نتیجے میں طلبہ کے اندر عزت نفس اور خودداری کا جذبہ فنا کر دیا جاتا ہے۔

مہتمم حضرات کو چاہیے کہ اگر وہ علم دین پڑھانا چاہتے ہیں تو صرف اتنے طالب علم اپنے مدارس میں رکھیں

میں(مدارس کیلئے چندہ مانگنے والے سفیروں) میں سے اکثر کو بدمعاش سمجھتا ہوں اوران کو چندہ دینا بھی گناہ سمجھتا ہوں میرے بس میں ہوتا تو میں ان سب سفیروں کوگرفتار کر لیتا۔

جن کی باعزت کفالت کا انتظام وہ کر سکیں۔اس سے زیادہ طالب علموں کو رکھنا زیادتی ہے اور قوم کے بچوں کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔

س: ہمارے ہاں دینی مدارس کے بڑے بڑے ذرائع آمدنی کیا ہیں؟

ج: بڑے بڑے ذرائع تو ہیں: زکوٰۃ،عشر،صدقات اور عطیات۔بعض مدارس میں تو یہ حال ہے کہ وہ کاروبار کے اڈّے بن گئے ہیں اور طلبہ کے ذریعے لوگوں سے پیسے وصول کرتے ہیں۔پھران پیسوں سے ان مدارس کے مہتمم حضرات بڑے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

ہر مدرسہ نے سفیروں کی ایک فوج بھرتی کی ہوتی ہے۔یہ سفیر شہر شہر اور گاؤں گاؤں جاکر مدرسہ کے نام پر چندے جمع کرتے ہیں اور جمع شدہ رقم پر مدرسہ سے اپنا کمیشن بھی وصول کرتے ہیں۔اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان سب سفیروں کو گرفتار کر لیتا اور کوئی ایسا شخص نہ چھوڑتا جو مدرسہ کے نام پر بھیک مانگ رہا ہوتا۔میں تو ان میں سے اکثر کو بدمعاش سمجھتا ہوں اور ان کو چندہ دینا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔میں ان کا سخت مخالف ہوں۔ان کو پیسے دینا قوم کے بچوں کو ذلیل کرنا ہے۔ان کو دیکھتے ہی مجھے آگ لگ جاتی ہے۔

س: آپ کے اپنے تجربے اور مشاہدے کے مطابق دینی مدارس میں آنے والے طلبہ کا اصل محرک کیا ہوتا ہے؟

ج: مدارس میں عموماً ایسے لڑکے ہی آتے ہیں جن کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہوتا۔اُن کے والدین مفلس

ہوتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اُن کا لڑکا مدرسہ میں پڑھ بھی لے اور اُس کے کھانے پینے کا بھی بندوبست ہو جائے۔ البتہ تھوڑے سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے والدین دیندار ہوتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ بھی علم دین حاصل کر لے لیکن عموماً ایسے لوگ ہی مدارس میں آتے ہیں جن کے پیشِ نظر سوائے معاش کے کوئی واضح مقصد نہیں ہوتا۔

س: آپ چونکہ اس نظام سے ایک عرصہ دراز سے وابستہ ہیں اس لیے آپ سے یہ سوال پوچھ رہا ہوں؟ کیا آپ کے علم کی حد تک مدارس کے مہتمم اور اساتذہ اپنے بچوں کو بھی مدارس میں تعلیم دلواتے ہیں؟

ج: اکثر حالتوں میں ایسا نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان مولویوں سے پوچھے گا جو لوگوں کے بچوں کو تو کہتے ہیں کہ دین پڑھو اور اپنے بچوں کو انگریزی پڑھاتے ہیں۔ مجھے 95% ایسے مولوی ملے ہیں جو اپنے بچوں کو انگریزی پڑھاتے ہیں اور قوم کے بچوں کو دین پڑھاتے ہیں۔ یہ خدا اور قوم دونوں کے ساتھ بغاوت ہے۔ اگر دین کا پڑھنا اچھا کام نہیں ہے تو دوسروں کے بچوں کو کیوں پڑھاتے ہیں؟ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو اپنے علم کے ساتھ کوئی تعلق، خلوص اور لگاؤ ہرگز نہیں ہے اور انہوں نے اپنے علم کو اپنے کھانے پینے کا ایک پیشہ بنا رکھا ہے۔

س: آپ مدارس کے نظام میں اصلاح کے لیے کیا تجویزیں پیش کرنا پسند کریں گے؟

ج: اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی اچھی اور اسلامی حکومت آ جائے تو وہ دینی مدارس کو اپنی تحویل میں لے کر خود چلائے اور ان غلط قسم کے لوگوں کے ہاتھوں سے نکالے۔ نظامِ تعلیم کی اصلاح بھی تب ہی ہوگی اور مدارس کا انتظام اور داخلی ماحول بھی درست ہو جائے گا۔ تاہم میں موجودہ حکومت کے دور میں اقدام کو مناسب نہیں سمجھتا۔

مولانا حامد علی

مہتمم مدرسہ خیر المعاد، ملتان

۵۔ اپریل ۱۹۷۵ء

حضرت مولانا حامد علی خان ۱۹۰۲ء میں رامپور محلہ زیارت والی میں پیدا ہوئے۔ آپ مصطفی آباد رامپور کے مشہور و معروف مذہبی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ حضرت کے والد کا نام مولانا شیدا علی خان تھا۔ آپ کے والد محترم علمی حلقوں میں مشہور و معروف تھے اور ان کا شمار رامپور کے معزز افراد میں ہوتا تھا۔

آپ نے مدرسہ عالیہ رامپور میں داخلہ لے لیا جہاں آپ نے مدرسہ عالیہ رامپور کے مروجہ تعلیمی نصاب کی تکمیل کی اور ہر سال کامیابی کے ساتھ امتیازی پوزیشن حاصل کرتے رہے۔ آپ نے ۱۹۳۰ء میں سند فراغت حاصل کی۔ اپنی خداداد صلاحیت و ذہانت کے باعث پورے مدرسہ عالیہ میں درجہ حدیث کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ انہوں نے رامپور کے مشہور اور یگانہ روزگار علماء سے علم حاصل کیا، جن میں حضرت مولانا حافظ حمایت اللہ خان رامپوری، حضرت علامہ فضل حق رام پوری، حضرت مولانا معز اللہ خان، حصرت مولانا نذیر الدین صاحب اور حضرت مولانا وجیہ الدین جیسے جید علماء و مشائخ شامل ہیں۔

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں مدرسہ اسلامیہ خیر المعاد رھتك میں صدر مدرس مقرر ہوئے اور باقاعدہ تدریس شروع کی۔ انھوں نے ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۴۷ء یعنی قیام پاکستان تك مدرسہ اسلامیہ خیرالمعاد میں قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم دی۔ اس دوران سینکڑوں طلباء نے کسبِ فیض کیا۔ مولانا حامد علی خان نے مسلمان بچیوں کی تعلیم و تربیت کے

لیے ایک عمارت بنوائی جہاں طالبات دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ سلائی کڑھائی کا کام بھی سیکھتی تھیں۔ قیام روھتک کے دوران حضرت مولانا حامد علی خان نے زبردست دینی، ملی اور علمی خدمات انجام دیں مگر یہ تمام کام نہایت خاموشی کے ساتھ فرماتے رہے۔مولانا حامد علی خان مسلم ایجوکیشن بورڈ ضلع روھتک کے صدر بھی رہے۔ یہ بورڈ مسلمان طلباء کو مفت مالی اور تعلیمی سہولتیں مہیا کرتا تھا اس بورڈ کا صدر دفتر علی گڑھ میں تھا اور اسے نواب حبیب الرحمان خان شیروانی کی سرپرستی حاصل تھی۔ آپ کی مساعی جمیلہ سے مسلمان روھتک کی جانب سے ہر سال کثیر رقم بورڈ کو بطور عطیہ بھیجی جاتی تھی اور ہر سال اعلیٰ استعداد کا مظاہرہ کرنے والے طلباء کو وظائف تسلیم کیے جاتے تھے۔

قیام پاکستان سے پہلے جب برصغیر کی تجارت ہندوئوں کے ھاتھوں میں تھی، آپ کی کوشش اور کاوش سے ۱۵لاکھ روپے کی خطیر رقم سے "مسلم ٹریڈ کمپنی" قائم کی گئی۔ اس کمپنی نے جلد ترقی کی اور مقامی تجارت پر ہندوئوں کی اجارہ داری ختم کر دی۔

حضرت مولانا حامد علی خان کو شروع ھی سے مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی معاملات سے دلچسپی تھی۔ وہ اسلام اور اسلامیانِ ہند کی بقاء کی خاطر چلنے والی ہر تحریک کے پرجوش سپاھی تھے۔ جب ۱۹۳۵ء میں تحریک مسجد شہید گنج شروع ھوئی تو آپ نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تحریک مسجد شہید گنج کی اخلاقی اور مالی امداد کی۔ دو قومی نظریئے کے تحت جب برصغیر کے مسلمانوں نے ھندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا اور حصولِ پاکستان کے لیے مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت "مسلم لیگ" نے تحریکِ پاکستان شروع کی تو دوسرے علماء اور

مشائخ اہلِ سنت کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا حامد علی نے بھی اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ ضلع روھتك کی مسلم لیگ کے ساتھ بڑھ چڑھ کر تعاون کیا اور مسلم لیگ کی سرپرستی فرمائی۔ جب سرکاری اہلکاروں نے روھتك مسلم لیگ کے قائدین کو گرفتار کر لیا تو آپ نے روھتك میں تحریك پاکستان کی قیادت سنبھالی۔ انھوں نے عملی سیاست کی ابتداء تحریك پاکستان سے کی۔

مولانا حامد علی خان ۱۲ نومبر ۱۹۵۹ء کو مستقل طور پر پاکستان منتقل ھوئے اور ملتان میں روھتك کے احباب کے اصرار پر مدرسہ اسلامیہ خیر المعاد کی بھاگ دوڑ سنبھالی جس کی بنیاد مولانا کے مشورے سے پہلے ھی رکھ دی گئی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد مولانا نے قومی، سیاسی اور دینی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ ۱۹۷۴ء میں جب پورے ملك میں تحریك ختم نبوت شروع ھوئی تو مولانا حامد علی خان نے جگہ جگہ جلوسوں اور جلسوں سے خطاب کیا۔

مولانا نے ۱۹۷۰ء میں اسلامی جماعتوں کے مشترکہ امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا لیکن بہت کم ووٹوں سے ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلے میں انتخابات ھار گئے۔

اسی طرح ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ایك دفعہ پھر سیاست کی وادی میں اترے اور پاکستان قومی اتحاد کے مشترکہ اُمیدوار کی حیثیت سے پیپلز پارٹی کے اُمیدوار بابو فیروز الدین انصاری کو شکست دیتے ھوئے قومی اسمبلی کے رُکن منتخب ھوئے۔ آپ نے نظامِ مصطفی کی تحریك میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ ایك بھرپور زندگی گزارنے کے بعد مولانا حامد علی جنوری ۱۹۸۰ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

ذاتی حالات

میرا تعلق ریاست رام پور (بھارت) سے ہے، وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور مدرسہ عالیہ رام پور سے سند فراغت حاصل کی، تفسیر بھی مدرسہ عالیہ میں پڑھی، کچھ عرصہ مدرسہ عالیہ میں پڑھایا پھر مدرسہ خیر المعاد رہتک میں پڑھاتا رہا۔ رہتک کے کئی خاندان پاکستان بننے کے بعد ملتان میں آ کر آباد ہوئے تو 1959ء میں خیر المعاد ملتان میں بھی قائم ہوا۔ میں اس سے قبل ملتان آ چکا تھا، تب سے اب تک اس مدرسہ کا انتظام چلا رہا ہوں اور پڑھا رہا ہوں۔

مدرسہ کے حالات

اس وقت مدرسہ میں تیس (30) طلبہ ہیں، درسِ نظامی پڑھ رہے ہیں۔ مدرسہ کے وسائل کچھ زیادہ نہیں ہیں، اللہ توکل پر چل رہا ہے۔ میرے علاوہ اس وقت مدرسہ میں چار اساتذہ اور ہیں۔ ضرورت تو کم از کم آٹھ اساتذہ کی ہے مگر مدرسہ کے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے۔ طلبہ کو چار مختلف جماعتوں میں تقسیم کر کے اساتذہ کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ طلبہ کو مولوی عالم اور مولوی فاضل کی تیاری بھی کرائی جاتی ہے اور یہ نصاب بھی پڑھایا جاتا ہے تاکہ سرکاری مدارس میں طلبہ کو ملازمتیں ملنے میں سہولت ہو، اس وقت تک کئی طلبہ ایم اے (عربی) کر کے اسکولوں میں پڑھا رہے ہیں۔ خطیب اور امام زیادہ بنتے ہیں۔

معیارِ تعلیم

میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا آپ اپنے مدرسہ کے معیارِ تعلیم سے پوری طرح مطمئن ہیں مولانا حامد علی صاحب نے کہا: ''معیارِ تعلیم یہاں بھی بتدریج گر رہا ہے اس کی کئی وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ طلبہ میں ذوق وشوق اور طلب کی کمی ہے۔ دوسرے معلمین بھی طلبہ کی صحیح مدد اور رہنمائی نہیں کرتے، نصاب تو خیر پرانا ہی ہے مگر پڑھانے کے طریقے بھی اس قدر پرانے اور دقیانوسی ہیں کہ موجودہ زمانے میں ان کا چلنا مشکل ہے۔ معیارِ تعلیم کو بلند کرنے

اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ جدید دور کے رائج علوم کو بھی ہمارے علماء اُسی ذوق وشوق سے سمجھیں جس طرح ہمارے علمائے قدیم نے قدیم یونانی فلسفہ کو سمجھا تھا۔

کے لیے طریقِ تعلیم کو بدلنا بہت ضروری ہے۔

درس نظامی کا مقصد

درسِ نظامی کا مقصد قرآن وحدیث کا فہم حاصل کرنا ہے اور طلبہ میں ایسی استعداد پیدا کرنا ہے کہ وہ اسلام کو سمجھ سکیں۔ دراصل اسلام تو ایسا فطری مذہب ہے کہ اس کے فطری اصولوں کو سمجھنے کے لیے کسی فلسفے اور منطق کی مدد کی بھی ضرورت نہیں ہے، محض قرآن وحدیث کا مطالبہ کافی ہے لیکن غیروں کی طرف سے قرآن وحدیث پر جو عقلی، فلسفیانہ اور منطقی اعتراضات وارد کیے جاتے ہیں ان کے ابطال کے لیے ضروری تھا کہ فلسفہ، منطق اور عقلیت کے اصولوں سے بھی واقفیت بہم پہنچائی جائے اور انہی کے رنگ اور انہی کے انداز میں قرآن وسنت کے حقائق کا اثبات کر کے ان اعتراضات کو غلط ثابت کیا جائے۔ چنانچہ فلسفہ، منطق اور کلام جیسے مضامین کو بھی درس نظامی کے نصاب میں شامل کیا گیا تا کہ غیروں کو قرآن وسنت کے مطالب سمجھائے جا سکیں اور اُن کے غلط استدلال کو باطل ثابت کیا جا سکے۔

درس نظامی میں تبدیلی

میری نظر میں آج بھی اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ جدید دور کے رائج علوم کو بھی ہمارے علماء اُسی ذوق و شوق سے سمجھیں جس طرح ہمارے علمائے قدیم نے قدیم یونانی فلسفہ کو سمجھا تھا، یہ اس لیے ضروری ہے کہ جب تک ہم جدید علوم سے واقفیت بہم نہ پہنچائیں گے اُس وقت تک ان کی روشنی میں قرآن وسنت کی تعلیمات

میرا خیال ہے کہ جدید عمرانی علوم مثلاً سماجیات، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ بھی درسِ نظامی میں شامل ہونے چاہئیں۔

جدید طرز میں دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکیں گے۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو لوگ اپنے مانے ہوئے اصولوں کی بنا پر بھی قرآن و سنت کے مطالب پر ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ جدید عمرانی علوم مثلاً سماجیات، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ بھی درسِ نظامی میں شامل ہونے چاہئیں۔ انہیں قرآن کی روشنی میں سمجھنا پڑے گا اور پھر ان کے غلط اصولوں کی نشاندہی کر کے جدید دنیا کے مسائل کا حل تلاش کیا جائے گا۔
البتہ تبدیلیٔ نصاب میں غور، تدبر اور تدریج کی ضرورت ہے۔ درسِ نظامی میں ایسے علوم کو سمونا پڑے گا جن سے اسلامی روح کو کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس تبدیلی کے نتیجے میں کہیں ہم اصل مقصد سے دور تو نہیں جا رہے؟
سب سے زیادہ ضرورت عربی زبان پر مہارت حاصل کرنا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ہم جدت اور تبدیلی کے جوش میں متقدمین کی آراء اور اُن کی کوششوں کو نظر انداز نہ کر دیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ایسے علوم کو درسِ نظامی میں شامل کر لیں جن کے مطالعے سے ہم فہم قرآن سے بھی محروم ہو جائیں اور جدید علوم ہم پر اس قدر حاوی ہو جائیں کہ ہم اُن کے مطابق قرآن کی تعبیر اپنی رائے سے کرنے لگیں۔ اسلام کی روح میرے نزدیک یہ ہے کہ جمہور مسلمین نے جس کو دین کہا ہے اُس میں ہم اپنی کوئی الگ راہ نکالنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر ہر شخص اپنی رائے پر اصرار کرنے لگے تو مذہب پھر بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔

اجتہاد

اجتہاد ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے اس لیے کہ ہر زمانے میں نئے نئے مسائل سامنے آتے رہے ہیں اور ان مسائل پر اسلام کے نقطۂ نظر سے غور کیا جا رہا ہے۔ لیکن غور کرنے کے بھی کچھ اصول ہیں۔ آج بھی یہ ممکن ہے کہ بعض اہم مسائل پر فیصلہ کرنے کے لیے تمام مکاتبِ فکر کے علماء باہم جمع ہوں اور مل کر غور و خوض کے ذریعے مسائل کو طے کریں۔ آج کے دور میں اجتماعی اجتہاد ہی معتبر ہو سکتا ہے۔

مولانا
ابوعمار زاهد الراشدی

جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۲۰۰۷ء، ۲۰۰۹ء، ۲۰۱۰ء

مولانا زاهد الراشدی کی ولادت ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو گکھڑ ضلع گوجرانواله میں هوئی۔ ان کے والد مولانامحمد سرفراز خان صفدر دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور مولانا حسین احمد مدنی کے ممتاز تلامذه میں سے تھے جنھوں نے کم و بیش ساٹھ سال تک تدریسی خدمات سرانجام دیں اور دیوبندی مسلك کے علمی ترجمان سمجھے جاتے تھے۔ مولانا زاهد الراشدی نے حفظ قرآن کریم اور صرف و نحوکی ابتدائی تعلیم گھر میں اپنے والد اور دیگر اساتذه سے حاصل کی۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تك مدرسه نصرة العلوم گوجرانواله میں درس نظامی کی تعلیم پائی۔ ۱۹۷۰ء میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ تب سے مرکزی جامع مسجد گوجرانواله میں خطابت کے فرائض سرانجام دے رهے هیں۔ مولانا زاهدالراشدی دینی علوم کی تدریس کے شعبے سے بھی مسلسل وابسته هیں۔ پهلے مدرسه انوار العلوم گوجرانواله میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رهے اور اب کئی برسوں سے مدرسه نصرة العلوم گوجرانواله میں شیخ الحدیث، صدر مدرس اور ناظمِ تعلیمات کی ذمه داریاں ان کے سپرد هیں۔

سیاسی طور پر جمعیۃ علماء اسلام پاکستان سے وابستہ رہے اور کم و بیش پچیس برس تک صوبائی اور مرکزی سطح پر مختلف عہدوں پر متحرک کردار ادا کرتے رہے۔ انھیں مولانا مفتی محمود کے رفیق کار اور معاون کے طور پر سالہا سال خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا۔ ۱۹۹۱ء کے بعد سے انتخابی سیاست سے ہٹ کر فکری اور علمی حوالہ سے اسلامائزیشن کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے پاکستان شریعت کونسل کے پلیٹ فارم سے مختلف سرگرمیاں انجام دیتے رہتے ہیں۔۱۹۸۹ء سے انھوں نے گوجرانوالہ سے ایک علمی و فکری جریدہ ماہنامہ "الشریعہ" کا آغاز کیا جو اسلام اور ملّت اسلامیہ کو درپیش معروضی مسائل کے حوالے سے اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ گوجرانوالہ میں انھوں نے الشریعہ اکادمی کے نام سے ایک علمی و فکری ادارہ قائم کر کھا ہے جس کے تحت وہ دینی مدارس کے اساتذہ و طلبہ کے لیے مختلف تربیتی کورسز، ورک شاپس، سیمینار اور فکری نشستوں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ صحافت کے میدان میں بھی مولانا زاہد الراشدی وسیع تجربہ رکھتے ہیں اور کم و بیش چالیس سال سے ملک کے معروف روزناموں اورجریدوں میں مسلسل لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ آج کل روزنامہ پاکستان لاہور میں "نوائے قلم" کے عنوان سے اور روزنامہ اسلام لاہور میں "نوائے حق" کے نام سے ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں۔ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیرِ اہتمام ان کے متعدد تحریری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی بعض تحریریں ان کی ویب سائٹ www.zahidrashdi.org پر ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

س: آپ کے خیال میں مدارسِ دینیہ کی نمایاں خدمات کیا ہیں؟

ج: ان مدارس نے جو نمایاں خدمات سرانجام دیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

☆ مساجد میں امامت اور قرآنِ کریم کی تعلیم کے نظام کو باقی رکھنے کے لیے ائمہ مساجد، خطبا اور حفاظ قرآن تیار کیے، چنانچہ آج جنوبی ایشیا کے مسلم معاشرہ میں جتنی مساجد آباد ہیں اور جتنے مکاتب قرآنِ کریم کی تعلیم دے رہے ہیں، ان میں انہی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات کام کر رہے ہیں۔

☆ قرآنِ کریم، حدیث نبوی، فقہ اسلامی، عربی و فارسی زبانوں اور دیگر متعلقہ علوم کی حفاظت و تدریس کا اہتمام کیا اور درس نظامی کے اس نظام و نصاب کو آج تک باقی رکھا جسے برطانوی حکومت اپنے خیال میں جڑ سے اکھاڑ کر سمندر میں پھینک چکی تھی۔

☆ مسلمانوں کے عقیدہ وفکر کی حفاظت کی اور توحید و سنت کے سرچشمہ کے ساتھ انہیں وابستہ رکھنے کے علاوہ اس خطہ میں مسیحیت کو فروغ دینے کی مساعی کی روک تھام کی اور انکار سنت، انکار معجزات، عقل پرستی، شرکت و بدعت، انکار ختم نبوت اور دیگر اعتقادی و عملی فتنوں کا مقابلہ کیا۔

☆ مسلمانوں میں حریت اور آزادی کے جذبہ کو باقی رکھا اور خود مختاری کے جذبات کی آبیاری کرتے ہوئے تحریک آزادی کو سینکڑوں قائدین اور ہزاروں کارکنوں کی کھیپ ہر دور میں مہیا کی۔

☆ عام مسلمانوں میں دعوت و اصلاح کے عمل کو جاری رکھا۔ آج یہ عمل پوری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور دینی مدارس کے فضلا کا اس میں بہت بڑا کردار ہے۔

☆ تحریر و تقریر کے میدان بھی بڑے بڑے مصنفین، محققین، دانش ور اور خطباء پیدا کیے جن کے تذکرہ کے لیے مستقل کتاب درکار ہے اور اس طرح علمی و تحقیقی میدان میں بھی علما کی جدوجہد کے تسلسل کو قائم رکھا۔

دینی مدارس کی انہی خدمات کی وجہ سے مغربی استعمار انہیں اپنی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے اور ان دینی مدارس کو ختم کرنے یا سرکاری کنٹرول میں لا کر بے اثر بنانے کے لیے وقتاً فوقتاً منصوبے بنتے رہتے ہیں، جبکہ یہ دینی مدارس سمجھتے ہیں کہ ان کی مذکورہ بالا خدمات اور کارکردگی کا تسلسل اور اثرات صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتے ہیں جب وہ سرکاری مداخلت سے آزاد ہوں، مالی طور پر خود مختار ہوں اور نصاب و نظام کے معاملات خود ان کے اپنے کنٹرول میں ہوں، ورنہ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کے زیر اثر ریاستی مشینری کو مداخلت کا موقع دینے سے دینی مدارس کا یہ سارا نظام مجروح ہوگا اور وہ مشنری جذبہ کے ساتھ مذکورہ بالا مقاصد کے لیے کام نہیں کر سکیں گے۔

س: دینی مدارس کے بارے میں ان دنوں عام طور پر یہ تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ یہ مدارس ''بنیاد پرستی'' کو فروغ دے رہے ہیں جو ''گلوبلائزیشن'' کے اس دور میں ''ملٹی نیشنل کلچر'' اور مشترکہ عالمی سوسائٹی کی تشکیل میں رکاوٹ ہے؟

ج: جہاں تک ''بنیاد پرستی'' کا تعلق ہے، اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مدارس عام مسلمانوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے وابستہ رکھے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں اسلامی ''سیکولرزیشن'' کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے جو مذہب کے اجتماعی کردار کی نفی کرتے ہوئے سوسائٹی کی اجتماعی عقل و خواہش کی بنیاد پر سیکولر ثقافت کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کے درپے ہے تو ''دینی مدارس'' کو اس الزام کو قبول کرنے میں کوئی انکار نہیں، بلکہ وہ اسے اپنے لیے الزام کے بجائے اعزاز اور کریڈٹ سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے اس کردار کی اثر خیزی کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔

س: یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ان مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات مختلف جہادی تحریکات میں عسکری خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور اس طرح یہ مدارس ''دہشت گردی'' کے فروغ کا باعث ہیں۔ نیز ان مدارس میں

کسی دینی ادارے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ قرآن وسنت کی دیگر تعلیمات کا تو اپنے ہاں اہتمام کرے مگر جہاد سے متعلق آیات قرآنی، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وسلم اور فقہی ابواب کو صرف اس لیے نصاب سے خارج کر دے کہ دنیا کے کچھ حلقہ اس سے ناراض ہوتے ہیں۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ عسکری ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

ج: اس سلسلے میں عرض ہے کہ دو مسئلے قطعی طور پر الگ الگ ہیں۔ ایک مسئلہ جہاد کے بارے میں شرعی احکام اور قرآن وسنت کے احکام وقوانین کے مطابق ہے۔ یہ دینی تعلیمات کا حصہ ہے اور کسی دینی ادارے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ قرآن وسنت کی دیگر تعلیمات کا تو اپنے ہاں اہتمام کرے مگر جہاد سے متعلق آیات قرآنی، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وسلم اور فقہی ابواب کو صرف اس لیے نصاب سے خارج کر دے کہ دنیا کے کچھ حلقہ اس سے ناراض ہوتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ جہاد کی عملی تربیت اور عسکری ٹریننگ کا ہے۔ یہ ان مدارس میں کسی سطح پر نہیں ہوتی اور نہ ہی ان مدارس میں ایسا کوئی نظام موجود ہے جو طلبہ کو اس طرح کی ٹریننگ دیتا ہو، حتیٰ کہ سرکاری کالجوں اور سکولوں میں این سی سی طرز کی جو نیم فوجی تربیت عام طلبہ کو دی جاتی ہے، دینی مدارس کے نظام میں وہ بھی باضابطہ طور پر موجود نہیں ہے، اس لیے یہ کہنا قطعی طور پر غلط ہے کہ دینی مدارس اپنے طلبہ کو عسکری ٹریننگ دیتے ہیں۔ البتہ دینی مدارس کے طلبہ یہاں سے فارغ ہو کر یا چھٹیوں کے دوران میں اپنی آزادانہ مرضی سے کسی دباؤ کے بغیر جہادی تحریکات کے مراکز میں جاتے ہیں، ٹریننگ حاصل کرتے ہیں اور کسی نہ کسی محاذ پر جہاد میں شریک بھی

دینی مدارس کے طلبہ بھی اگر تعلیمی نظام اور ڈسپلن سے ہٹ کر جہادی تحریکات میں شامل ہوتے ہیں اور عسکری تربیت حاصل کر کے کسی کارروائی میں حصہ لیتے ہیں تو ان کے لیے دینی مدارس کو ذمہ دار قرار دینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔

ہوتے ہیں، لیکن اس کا مدارس کے نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ٹریننگ کے یہ مراکز مدارس کے سسٹم میں شامل ہیں۔ ان کا نظم اور ذمہ داری بالکل مختلف دائرہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے لیے دینی مدارس کو ذمہ دار ٹھہرانا قطعی طور پر غلط بات ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے سرکاری کالجوں، سکولوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہزاروں نوجوان مختلف عسکری تنظیموں میں شامل ہو جاتے ہیں جن میں جہادی تحریکات بھی ہیں، لسانی گروپ بھی ہیں، علاقائی تنظیمیں بھی ہیں اور طبقاتی گروہ بھی ہیں، حتیٰ کہ ڈکیتی اور رہزنی کے گینگ بھی ان میں شامل ہیں۔ یہ نوجوان بھی مختلف ٹریننگ سنٹروں میں عسکری تربیت حاصل کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر کارروائیاں کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی گروہ کی کارروائیوں کا ذمہ داران کے تعلیمی اداروں کو قرار نہیں دیا جاتا اور انہیں ان کے ذاتی فعل اور فیصلے پر محمول کیا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی دینی مدارس کے طلبہ بھی اگر تعلیمی نظام اور ڈسپلن سے ہٹ کر جہادی تحریکات میں شامل ہوتے ہیں اور عسکری تربیت حاصل کر کے کسی کارروائی میں حصہ لیتے ہیں تو ان کے لیے دینی مدارس کو ذمہ دار قرار دینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔

س: قومی سطح پر یہ مدارس اجتماعی دھارے میں شامل ہونے کے بجائے الگ تشخص قائم رکھنے پر مصر ہیں اور مروجہ ریاستی نظام تعلیم کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ قبول نہیں کر رہے جس کی وجہ سے قوم میں ''دوذہنی'' کی

دینی مدارس کے جداگانہ تعلیمی نظام اور معاشرہ میں ''دوذہنی'' اور ''تعلیمی دوئی'' کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری ریاستی نظام پر عائد ہوتی ہے جو اس کردار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جو ان دینی مدارس کے جداگانہ وجود کا باعث ہے۔

فضا موجود ہے اور یہ دوہرا نظام قومی یکجہتی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟

ج: جہاں تک قومی اجتماعی دھارے سے الگ رہنے اور جداگانہ تشخص قائم رکھنے کا سوال ہے، اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اس کا تعلق بھی ان مدارس کے مقصدِ وجود سے ہے، کیونکہ جب تک ریاستی نظام معاشرہ میں دینی تعلیمات کے فروغ، مساجد کے ائمہ کی فراہمی، دینی راہنمائی کے لیے علمائے کرام کی تیاری اور قرآن وسنت کی تعلیم کے لیے اساتذہ مہیا کرنے کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اس کے لیے قابلِ قبول عملی نظام پیش نہیں کرتا، اس وقت تک ان مدارس کے قیام و وجود کی ضرورت بہرحال باقی رہے گی، ورنہ وہی خلا پیدا ہو جائے گا جس کو پُر کرنے کے لیے یہ مدارس قائم کیے گئے تھے اور اس ''خلا'' کو باقی رکھنے کا کوئی باشعور مسلمان رسک نہیں لے سکتا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے نہ صرف ان مدارس کا وجود ضروری ہے بلکہ ان کی اس مالیاتی خودمختاری، انتظامی آزادی اور نصابی تحفظات کا برقرار رکھنا بھی ناگزیر ہے جس کے بغیر یہ اپنا کردار اعتماد کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے، اس لیے دینی مدارس کے جداگانہ تعلیمی نظام اور معاشرہ میں ''دوذہنی'' اور ''تعلیمی دوئی'' کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری ریاستی نظام پر عائد ہوتی ہے جو اس کردار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جو ان دینی مدارس کے جداگانہ وجود کا

باعث ہے، مگر ان مدارس کو اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کی خواہش کا بار بار اظہار کر رہا ہے جس کا منطقی نتیجہ معاشرہ میں دینی تعلیم کے اس نظام کو یکسر ختم اور بے اثر کر دینے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

س: دینی مدارس اپنے خلاف ملکی اور عالمی سطح پر پائی جانے والی مہم کو موجودہ عالمی حالات میں کس نظر سے دیکھتے ہیں اور موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش میں ان کا موقف کیا ہے؟

ج: دینی مدارس کا بنیادی موقف ہی یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی کی راہنمائی اور قیادت کے لیے انفرادی یا اجتماعی ''عقل وخواہش'' کافی نہیں بلکہ اس کے لیے وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی نگرانی اور بالادستی ضروری ہے اور اس سے ہٹ کر اباحیت مطلقہ اور ہمہ نوع آزادی کی بنیاد پر جس کلچر کو ''گلوبل سولائزیشن'' کے نام پر فروغ دیا جا رہا ہے، وہ سراسر غلط ہے، گمراہی ہے اور نسل انسانی کو مزید تباہی اور انارکی کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہے۔ اگر دینی مدارس اس موقف میں لچک پیدا کر لیں تو خود ان کا مقصدِ وجود ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور ان کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا، اس لیے اس معاملہ میں دینی مدارس کسی قسم کی کوئی لچک قبول کرنے کے روادار نہیں ہیں۔

س: دینی مدارس اپنے نصاب میں جدید علوم اور آج کی ضروریات مثلاً سائنس، ریاضی، انگلش زبان اور کمپیوٹر وغیرہ کو شامل کیوں نہیں کر رہے اور انہیں اس سلسلہ میں کیا رکاوٹ اور حجاب ہے؟

ج: جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ دینی مدارس اپنے نصاب میں انگلش زبان، سائنس، ریاضی اور دیگر جدید ضروری علوم وفنون کو شامل کرنے سے کیوں انکاری ہیں، اس کے جواب میں تین گزارشات پیش خدمت ہیں:

پہلی گزارش یہ ہے کہ دینی مدارس کو جائز حد تک ان علوم وفنون کو اپنے نصاب میں شامل کرنے سے کوئی انکار

بنیادی تعلیم کے بعد دینی علوم کے نصاب میں دیگر شعبوں کے مضامین شامل کرنے کا مطالبہ بھی ہمارے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے لا کالج میں سائنس پڑھانے کا مطالبہ کیا جائے یا میڈیکل کالج میں قانون پڑھانے کا تقاضا کیا جائے۔

نہیں ہے۔ اب تک مسئلہ زیادہ تر وسائل کا رہا ہے کہ دینی مدارس کے وسائل محدود ہوتے ہیں اور انہیں تھوڑے وسائل کے ساتھ اپنا کام چلانا پڑتا ہے، لیکن اس کے باوجود دینی مدارس نے انگریزی، ریاضی، سائنس اور کمپیوٹر ٹریننگ وغیرہ کے مضامین کو اپنے نصاب میں بتدریج شامل کرنے کا سلسلہ کچھ عرصہ سے شروع کر رکھا ہے اور دینی مدارس کے تمام وفاق میٹرک کی سطح تک اپنے نصاب میں یہ مضامین شامل کر چکے ہیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ ان مضامین کو نصاب میں شامل کرنے کی جائز حد دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کے نزدیک میٹرک ہے۔ اس کے بعد کے نصاب میں ان مضامین کی شمولیت ضروری نہیں بلکہ بعض حوالوں سے نقصان دہ ہے، اس لیے میٹرک کے بعد کے درجات میں ان مضامین کو شامل نصاب کرنے کے لیے دینی مدارس تیار نہیں ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد تعلیم کے دائرے تقسیم ہو جاتے ہیں اور ہر دائرہ میں اس شعبہ کے مضامین کی تعلیم ہوتی ہے، اس میں دوسرے شعبوں کے مضامین کو شامل نہیں کیا جاتا۔ مثلاً لا کالج میں صرف قانون کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور اس میں سائنس پڑھانے کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، انجینئرنگ میں صرف اس سے متعلقہ مضامین کی تعلیم ہوتی ہے اور اس میں قانون پڑھانے کا کوئی تقاضا نہیں ہوتا اور میڈیکل کالج میں صرف طب سے متعلقہ مضامین شامل نصاب ہوتے ہیں اور اس میں انجینئرنگ کے

مضامین کی تعلیم کو ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔اسی طرح دینی تعلیم بھی ایک مستقل شعبہ ہے اور بنیادی تعلیم کی حد میٹرک ہو یا ایف اے،اس کے بعد دینی علوم کے نصاب میں دیگر شعبوں کے مضامین شامل کرنے کا مطالبہ بھی ہمارے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے لا کالج میں سائنس پڑھانے کا مطالبہ کیا جائے یا میڈیکل کالج میں قانون پڑھانے کا تقاضا کیا جائے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں معاصر قوتوں سے بہت زیادہ پیچھے رہ گئے ہیں اور اس کا احساس ہمیں زیادہ ہے جو مسلمانوں کے عقیدہ وثقافت کے تحفظ کی جنگ میں مغرب کے مقابلہ میں عملی طور پر صف آرا ہیں اور صرف ایک مثال سے اس صورت حال کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ آج سے ایک صدی قبل اللہ تعالیٰ نے ہمارے زوال وادبار کے دور میں ہمیں خلیج عرب میں تیل کے سرچشموں کی عظیم دولت سے نوازا تھا مگر ہماری نااہلی کی صورت حال یہ تھی کہ ہم زمین کھود کر تیل نکالنے کی صلاحیت سے محروم تھے،تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی اہلیت ہم میں نہیں تھی اور ریفائن کرنے کے بعد اسے دنیا میں بیچنے یعنی مارکیٹنگ کی صلاحیت سے بھی ہم بے بہرہ تھے،مگر ہم نے اپنی اس نااہلی کو دور کرنے اور ان چیزوں کی صلاحیت حاصل کرنے کی بجائے اس کام کے لیے مغربی ماہرین کو بلایا۔ماہرین آئے،ان کے بعد مغرب کی کمپنیاں آئیں،پھر دولت سمیٹنے کے لیے مغرب کے بینک آ گئے،ان کے پیچھے کنٹرول حاصل کرنے کے لیے سفارت کاروں اور سیاست کاروں نے چکر لگانا شروع کیے اور آخر میں مغربی ممالک کی فوجیں آئیں جو تیل کے چشموں کا گھیرا ڈالے بیٹھی ہیں۔

زمین ہماری ہے،چشمے ہمارے ہیں،اور تیل بھی ہمارا ہے،لیکن کنٹرول مغربی کمپنیوں کا ہے اور تیل سے حاصل ہونے والی دولت مغربی بینکوں میں ہے جو ہماری نااہلی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ نہ دینے کا نتیجہ

زمین ہماری ہے، چشمے ہمارے ہیں، اور تیل بھی ہمارا ہے، لیکن کنٹرول مغربی کمپنیوں کا ہے اور تیل سے حاصل ہونے والی دولت مغربی بینکوں میں ہے جو ہماری نااہلی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ نہ دینے کا نتیجہ ہے۔

ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہم آج بھی پون صدی گزر جانے کے باوجود ان تینوں صلاحیتوں سے کورے ہیں لیکن اس بات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کے دوسری قوتوں سے پیچھے رہ جانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اور اس میں دینی مدارس کا قصور کیا ہے؟

۱۸۵۷ء میں دہلی پر تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد جب متحدہ ہندوستان میں ہمارے صدیوں سے چلے آنے والے نظام تعلیم کو کلیتاً ختم کر دیا گیا اور تمام تر تعلیمی اور تہذیبی نظام کو تلپٹ کر کے رکھ دیا گیا تو اس وقت تعلیمی محاذ پر دو طبقے سامنے آئے۔ ایک علمائے کرام کا گروہ تھا جس نے مسجد و مدرسہ کو آباد رکھنے، قرآن و سنت کی تعلیم کا سلسلہ باقی رکھنے، مسلمانوں کے عقیدہ و اعمال کے تحفظ اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا تسلسل جاری رکھنے کی ذمہ داری قبول کی اور اس کے لیے کسی قسم کے ریاستی وسائل اور حکومتی تعاون سے بے نیازی اختیار کرتے ہوئے عام مسلمانوں کے رضا کارانہ تعاون سے دینی مدارس کے آزادانہ نظام کی بنیاد رکھی، جبکہ دوسری طرف انگریزی زبان اور سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر علوم میں مسلمانوں کو دوسری اقوام کے برابر لانے ذمہ داری جدید تعلیم کے علم برداروں نے قبول کی اور ایک مستقل نظام تعلیم کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اس نظام کا آغاز بھی رضا کارانہ چندہ سے ہوا تھا، لیکن اسے بتدریج ریاستی وسائل اور حکومتی تعاون حاصل ہوتا چلا گیا اور بہت

جلد ریاست وحکومت نے اس نظام کی تمام تر ذمہ داری اور اخراجات اپنے کھاتے میں ڈال لیے۔

دینی مدارس نے اپنا نظام عام مسلمانوں کے چندہ سے چلایا اور کسی حکومت سے نہ مالی امداد طلب کی اور نہ ہی کسی حکومت کی مالی مدد اس درجہ میں قبول کی کہ اس پر مدارس کے نظام کا انحصار ہو۔ علمائے کرام نے اپنی عزت نفس کی پروانہ کرتے ہوئے زکوٰۃ مانگی، صدقات مانگے، خیرات مانگی، عطیات مانگے، حتیٰ کہ ایک ایک دروازے پر دستک دے کر روٹیاں مانگیں۔ میں نے خود طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ کے مختلف محلوں میں سر پر چھابہ رکھ کر گھروں سے روٹیاں مانگی ہیں۔ ہم چند طالب علم گھروں کے دروازے کھٹکھٹا کر روٹیاں مانگ کر لاتے تھے اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے سب طلبہ وہ روٹیاں کھا کر تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ برصغیر کے طول وعرض کے اکثر مدارس میں ایک عرصہ تک جاری رہا اور اس طریقہ سے دینی مدارس نے نہ صرف عام مسلمانوں تک قرآن و حدیث کی تعلیم کو پہنچایا ہے بلکہ ان کی مسجدوں اور مدرسوں کو آباد رکھا ہے، ملک بھر کی لاکھوں مساجد میں نماز پڑھانے والے امام مہیا کیے ہیں، قرآن کریم کی تعلیم دینے والے اور رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن کریم سنانے والے لاکھوں حافظ اور قاری فراہم کیے ہیں، دینی علوم کی تعلیم دینے والے لاکھوں مدرسین تیار کیے ہیں، مسائل بتانے والے ہزاروں مفتی پیدا کیے ہیں، خطبات دینے والے خطیب مقرر اور واعظ تیار کیے ہیں، کتابیں لکھنے والے مصنفین دیے ہیں، دنیا بھر میں دین اسلام کی دعوت دینے والے لاکھوں مبلغین بھیجے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر میدان جنگ میں کفر وظلم کے خلاف ہتھیار اُٹھا کر جنگ کرنے والے ہزاروں مجاہدین بھی ان مدارس نے فراہم کیے ہیں، اس لیے اپنی ذمہ داری اور مشن کے حوالے سے دینی مدارس پر کوتاہی کا کوئی الزام عاید نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ملک کے کسی حصے میں نماز پڑھانے کے لیے امام میسر نہیں ہے، جمعہ پڑھانے کے لیے خطیب نہیں مل رہا،

سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کی ذمہ داری دینی مدارس پر ڈالنا انصاف کی بات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ان لوگوں سے دریافت کیجیے جنھوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی، سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے برابر لانے کا عہد کیا تھا۔

قرآن کریم پڑھانے والا قاری اور رمضان المبارک میں قرآن کریم سنانے کے لیے حافظ موجود نہیں ہے، دینی علوم کی تعلیم و تدریس کے لیے مدرسین کی کمی ہے، مسئلہ بتانے والے مفتی حضرات کا فقدان ہے یا دین کی دعوت دینے والے مبلغین کی آواز نہیں پہنچ رہی تو اس کے لیے دینی مدارس کو مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے اور ان کی کوتاہی شمار کیا جا سکتا ہے، لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کی ذمہ داری دینی مدارس پر ڈالنا انصاف کی بات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ان لوگوں سے دریافت کیجیے جنھوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی، سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے برابر لانے کا عہد کیا تھا، اس کے لیے کم از کم ایک صدی سے انہیں ریاستی وسائل میسر چلے آ رہے ہیں اور قومی بجٹ کا ایک بڑا حصہ ان کے لیے وقف ہوتا ہے۔ ان سے پوچھیے کہ وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں کے برابر لانے میں کیوں کامیاب نہیں ہوئے؟ بلکہ میری گزارش ہے کہ اس مقصد کے لیے قومی تعلیمی کمیشن قائم کیا جائے جو اس بات کا جائزہ لے کہ ریاستی نظام تعلیم ملی اور قومی

ایک خالص اسلامی نظریاتی ریاست وحکومت کے نظام کی بالا دستی قبول کرنے سے دینی مدارس کو قطعی طور پر کوئی انکار نہیں ہو سکتا، لیکن سیکولر اہداف رکھنے والے ریاستی نظام کے کنٹرول کو قبول کرنا دینی مدارس کے لیے اپنے بنیادی مشن اور ہدف سے محروم ہو جانا ہو گا۔

مقاصد کے حصول میں کیوں ناکام رہا ہے؟ اس کی ذمہ داری کا تعین کیا جائے اور اس عظیم ناکامی کی تلافی کے لیے اقدامات وتجاویز طے کی جائیں۔ چنانچہ میں نے گورنر پنجاب سے اپنے مضمون میں گزارش کی ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں قوم کے پیچھے رہ جانے کا رونا ضرور روئیں اور ان علوم کی طرف توجہ کی تلقین بھی ضرور کریں لیکن اس شکوہ اور تلقین کی جگہ جامعہ اشرفیہ نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی ہے۔ وہاں کھڑے ہو کر یہ گلے شکوے دھرائیں اور اپنی ناکامی کی سیاہی غریب مولوی کے چہرے پر ملنے کی کوشش نہ کریں۔

س: جب ملک کے ہزاروں تعلیمی ادارے حکومتی انتظام کے تحت چل رہے ہیں اور حکومت کے مختلف شعبے ان کا کامیابی کے ساتھ انتظام چلا رہے ہیں تو دینی مدارس کو سرکاری کنٹرول میں آنے سے انکار کیوں ہے اور وہ اپنا جداگانہ نظام اور تشخص قائم رکھنے پر کیوں مصر ہے؟

ج: آپ کا سوال یہ ہے کہ جب ملک کے دیگر ہزاروں تعلیمی ادارے حکومتی کنٹرول میں چل رہے ہیں تو دینی مدارس کو سرکاری نظام وکنٹرول کے دائرہ میں آنے سے کیوں انکار ہے؟ اس کے جواب میں دو باتیں عرض کی جا رہی ہیں۔ ایک تو اصولی بات ہے اور دوسری واقعاتی۔

اصولی بات یہ ہے کہ تعلیم صرف ایک پیشہ ورانہ کام نہیں بلکہ مشن ہے جس کے کچھ اہداف ہوتے ہیں اور جس کا

کوئی مقصد ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان مشرق اور مغرب جیسی دوری ہے اور دونوں کا ہدف اور ٹارگٹ ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے سے متضاد ہے، اس لیے دینی مدارس کے نظام کو ریاستی نظام کے تابع کرنے کا مطلب اس ہدف، مشن اور مقصد سے دست برداری ہوگا جس کے لیے دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اگر ریاستی نظام تعلیم اپنا قبلہ درست کر لے جو ایک نظریاتی اسلامی ریاست اور حکومت قائم ہونے کے بعد ہی ممکن ہے تو ایک خالص اسلامی نظریاتی ریاست وحکومت کے نظام کی بالادستی قبول کرنے سے دینی مدارس کو قطعی طور پر کوئی انکار نہیں ہوسکتا، لیکن سیکولر اہداف رکھنے والے ریاستی نظام کے کنٹرول کو قبول کرنا دینی مدارس کے لیے اپنے بنیادی مشن اور ہدف سے محروم ہو جانا ہوگا، اس لیے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری بات واقعاتی ہے جو اس اصولی گزارش کی عملی تصدیق کرتی ہے کہ بعض دینی مدارس کو سرکاری نظام کے تحت چلانے کا تجربہ ہم اس سے قبل کر چکے ہیں جو ناکام ثابت ہوا ہے۔ صدر ایوب خان مرحوم کے دور میں محکمہ اوقاف قائم ہوا تھا جس نے ملک بھر میں ہزاروں مساجد، مزارات اور ان کے ساتھ بیسیوں مدارس کو تحویل میں لے لیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ان کا نظام صحیح نہیں ہے اور ان کی مالیات میں گڑبڑ ہوتی ہے، اس لیے انہیں سرکاری تحویل میں لیا گیا ہے تاکہ ان کے نظام کو زیادہ بہتر طریقہ سے چلایا جائے، لیکن عملاً یہ ہوا کہ نظام پہلے سے بھی خراب ہوگیا جس کا مشاہدہ محکمہ اوقاف کے زیرِ انتظام مساجد اور عام مسلمانوں کی آزادانہ کمیٹیوں کے تحت قائم مساجد کے نظاموں کا کسی بھی شعبہ میں تقابل کر کے کیا جا سکتا ہے، جبکہ محکمہ اوقاف نے کتنے ہی دینی مدارس بھی اس وقت تحویل میں لیے جن کا وجود تک باقی نہیں رہا اور اس کی ایک واضح مثال اوکاڑہ کے گول چوک کی جامع مسجد میں قائم جامعہ عثمانیہ کی شکل میں موجود ہے جس کا مشاہدہ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت جا کر کر سکتا ہے۔ محکمہ اوقاف کی تحویل میں جانے سے قبل یہ مدرسہ ملک کے اہم مدارس میں شمار ہوتا تھا اور اس میں سینکڑوں طلبہ ہاسٹل میں رہتے تھے مگر اب وہاں کوئی درس گاہ نہیں ہے، جبکہ مدرسہ کے کمرے محکمہ اوقاف نے مختلف لوگوں کو کرائے پر دے رکھے

ہیں۔ صدر محمد ایوب خان مرحوم ہی کے دور میں ریاست بہاولپور باقاعدہ طور پر پاکستان میں ضم ہوئی تو وہاں کا سب سے بڑا دینی مدرسہ جامعہ عباسیہ تھا جسے محکمہ تعلیم نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اسے اسلامی یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا، دینی نصاب تعلیم اور سرکاری نصاب کو ملا کر ایک مشترکہ نصاب تعلیم مرتب کیا گیا، علامہ شمس الحق افغانی، مولانا سیّد احمد سعید کاظمی اور مولانا عبد الرشید نعمانی جیسے بہت سے علمائے کرام کو مختلف حصوں سے اُٹھا کر بہاولپور میں بٹھایا گیا اور ایک ماڈل دار العلوم یا ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا اعلان کیا گیا، لیکن آج اس کی حالت یہ ہے کہ دینی نصاب تعلیم کے مضامین اس کے نصاب سے بتدریج خارج ہو چکے ہیں اور اس کا نصاب اب وہی ہے جو ملک کی دیگر سرکاری یونیورسٹیوں کا ہے جبکہ اس کے معیار کا حال یہ ہے کہ جس طالب علم کو ملک کی کسی اور یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ملتا، اس کے لیے اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔

محکمہ تعلیم اور محکمہ اوقاف دونوں کے ہاتھوں مختلف دینی مدارس کا یہ حشر دیکھنے کے بعد اگر دینی مدارس سے یہ توقع رکھی جا رہی ہے کہ وہ سرکاری کنٹرول کو قبول کر لیں گے اور محکمہ تعلیم یا محکمہ اوقاف کے نظام میں شامل ہونے کے بعد ان کی حالت پہلے سے بہتر ہوگی تو اسے سادگی اور بھولپن کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اس لیے بڑے ادب سے گزارش ہے کہ ہم ماضی قریب میں ماڈل دار العلوم اور سرکاری نظام کا تلخ تجربہ کر چکے ہیں اور اس تجربہ کو دہرانے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ مومن کا وصف یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔

س: اگر ورلڈ اسٹیبلشمنٹ یا ریاستی ادارے دینی مدارس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو دینی تعلیم کے جس جداگانہ تشخص کی بات کی جاتی ہے، اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ اور دینی حلقے اپنا روایتی کردار کس طرح برقرار رکھ سکیں گے؟

دینی مدرسہ بلڈنگ یا زمین کا نام نہیں ہے بلکہ مولوی اور سوسائٹی کے تعلق کا نام ہے۔ یہ تعلق اگر قائم ہے تو دینی مدرسہ بھی قائم ہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کرسکتی۔

ج: جیسا کہ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اس بات پر تلی بیٹھی ہے اور ریاستی ادارے بھی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ دینی مدارس کو اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کے سنہرے عنوان اور انہیں جدید وسائل اور سہولتیں فراہم کرنے کی خوشنما ترغیب کے ساتھ سرکاری کنٹرول میں لایا جائے تو اگر خدانخواستہ یہ عناصر اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر آزادانہ دینی تعلیم کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں، کیوں کہ طاقت کا استعمال اور چیز ہے اور فکر وعقیدہ کو تبدیل کرنا اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ آج کی عالمی اسٹیبلشمنٹ اور اس کا لیڈر امریکہ طاقت اور جبر وتشدد کے ذریعہ جسموں کو ختم کرسکتا ہے۔ وہ ''ڈیزی کٹر'' کی بارش کرسکتا ہے، انسانی جسموں کے پرخچے اڑا سکتا ہے اور بلڈنگوں اور آبادیوں کو تہس نہس کرسکتا ہے لیکن کسی کے ذہن وعقیدہ کو تبدیل کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

چند سال پہلے امریکہ کے وزیر خارجہ کولن پاول پاکستان تشریف لائے۔ آنے سے قبل ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ وہ پاکستانی معاشرے کو سیکولر بنانے کے ایجنڈے پر بھی بات کریں گے۔ ایک مضمون میں راقم الحروف نے ان سے گزارش کی کہ وہ اس پر اپنا وقت ضائع نہ کریں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان سے قبل اب سے دوصدیاں پہلے برطانیہ بھی اسی ایجنڈے پر جنوبی ایشیا میں آیا تھا۔ اس نے ہزاروں دینی مدارس بند کر دیے تھے، ان کی جائیدادیں ضبط کر لی تھیں، بلڈنگیں قبضے میں لے لی تھیں، بہت سی عمارات بلڈوز کر دی تھیں،

کیا آج تک کسی مولوی یا حافظ کو انہوں نے بھوکا مرتے دیکھا ہے؟ کسی مولوی، حافظ یا قاری کو بھوک اور فاقے کی وجہ سے خودکشی کرتے دیکھا ہے؟ یا پاکستان کی پوری تاریخ میں مولویوں، قاریوں، یا حافظوں کا کوئی جلوس سڑک پر آیا ہے کہ ان کا گزارا نہیں ہوتا، ان کی تنخواہیں بڑھائی جائیں۔

ہزاروں علمائے کرام کو شہید کر دیا تھا اور ہزاروں کو جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شہادت کے بعد ۱۹۴۷ء تک ایک سو نوے برس برطانیہ یہاں اسی ایجنڈے پر کام کرتا رہا، لیکن آج نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ مدارس کی تعداد پہلے سے زیادہ ہے، مولوی، حافظ، قاری، خطیب، مدرس، مبلغ اور مجاہد اپنی تعداد اور کارکردگی دونوں حوالوں سے پہلے سے بہتر پوزیشن میں ہیں، اس لیے کسی بھی طاقت ور کو یہ غلط فہمی ذہن سے نکال دینی چاہیے کہ وہ طاقت اور جبر کے ذریعے سے دینی تعلیم کو ختم کر سکتا ہے اور بلڈنگوں پر قبضہ کر کے، علمائے کرام کو گرفتار کر کے یا ان کے ایک حصے کو ملازمتوں اور سہولتوں کے نام پر جال میں پھانس کر دینی تعلیم اور اس کے آزادانہ کردار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بات بطور خاص قابل توجہ ہے کہ دینی مدرسہ بلڈنگ یا زمین کا نام نہیں ہے بلکہ مولوی اور سوسائٹی کے تعلق کا نام ہے۔ یہ تعلق اگر قائم ہے تو دینی مدرسہ بھی قائم ہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ میں اس پر ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں مولوی اور سوسائٹی کا تعلق قائم ہے۔ یہ تعلق لین کا بھی ہے اور دین کا بھی ہے۔ دین کا تعلق یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں کسی شخص کو اگر نماز پڑھتے ہوئے کسی بات پر شک ہو گیا ہے کہ نماز خراب تو نہیں ہو گئی تو اس کا یہ شک مولوی نے ہی دور کرنا

ہے۔ یہ شک عام مسلمان کو ہوا ہے، پارلیمنٹ کے ممبر کو ہوا ہے، ہائی کورٹ کے جسٹس کو ہوا ہے، پولیس کے آئی جی کو ہوا ہے یا اسٹیٹ بینک کے گورنر کو ہوا ہے، معاشرے کے کسی طبقہ کے کسی بھی شخص کو نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یا کسی دینی معاملہ میں اگر شک ہو گیا ہے تو اس کا شک بہرحال کسی مولوی سے پوچھ کر ہی دور ہوگا، اس کے سوا اس کی تسلی کی اور کوئی صورت نہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی صاحب سارا دن دفتر یا دکان میں کرسی پر بیٹھ کر مولوی کو برا بھلا کہتے رہے ہیں، مولوی کے عیوب اور ان کی کمزوریاں بیان کرتے رہے ہیں اور غریب مولوی کو بات بات پر کوستے رہے ہیں مگر شام کو گھر گئے تو کسی بات پر اہلیہ محترمہ سے تو تکار ہو گئی، غصے میں منہ سے کوئی الٹی سیدھی بات نکل گئی اور شک پڑ گیا کہ اب ہم میاں بیوی بھی رہے یا نہیں تو ان صاحب کا یہ شک بھی کسی مولوی نے ہی دور کرنا ہے، وہ اس شک سے نجات پانے کے لیے کسی تھانے میں نہیں جائیں گے اور نہ ہی پارلیمنٹ یا ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے، بلکہ اسی مولوی کے حجرے میں جائیں گے جسے سارا دن بیٹھے کوستے رہے ہیں۔ اس مولوی سے پوچھے بغیر ان کی تسلی نہیں ہوگی۔ یہ تو مولوی کا معاشرہ کے ساتھ دین کا تعلق ہے اور یہ وہ چیز ہے جو مولوی معاشرے کو دیتا ہے۔ دوسرا تعلق لین کا ہے کہ سوسائٹی مولوی کو کیا دیتی ہے؟ کسی گھر میں کوئی مصیبت یا پریشانی آ گئی ہے اور صاحب خانہ نے یہ حدیث مبارکہ سن رکھی ہے کہ صدقہ دینے سے بلائیں ٹلتی ہیں اور پریشانیاں دور ہوتی ہیں، ان صاحب نے صدقہ دینے کا ارادہ کیا ہے اور شہر کی بکرا منڈی میں گئے ہیں، وہاں سے انھوں نے صدقہ دینے کے لیے بکرا خریدا اور اس کی رسی پکڑے آ رہے ہیں، کیا خیال ہے وہ یہ بکرا کسی تھانے میں پہنچائیں گے؟ پارلیمنٹ میں لے جائیں گے؟ ہائیکورٹ کے دروازے پر باندھیں گے، یا سیکرٹریٹ کے کسی افسر کی نذر کریں گے؟ نہیں، بلکہ وہ کسی مسجد یا مدرسہ کا رُخ کریں گے جہاں کوئی مولوی صاحب دس بارہ طلبہ کو پڑھا رہے ہوں اور بکرا ان کے سپرد کر کے ہی انہیں اطمینان ہوگا کہ ان کا صدقہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔ یہ بکرا مولوی کا حق ہے اور مولوی نے ہی کھانا ہے، اس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اس

معاشرے میں دین کا مسئلہ صرف مولوی نے بتانا ہے اور صدقے کا بکرا مولوی نے ہی کھانا ہے، اس لیے جب تک مولوی اور سوسائٹی کا یہ دوطرفہ تعلق قائم ہے، ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اور اس کا لیڈر امریکہ اُلٹے لٹک جائیں، دینی مدرسہ ہمارے معاشرے میں بند نہیں ہوسکتا۔

س: دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس تعلیم کے حصول کے بعد ملازمت کی کوئی گارنٹی نہیں ہے اور روزگار کے تحفظ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کا حل کیا ہے؟

ج: آپ کا سوال یہ ہے کہ دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم پر روزگار کا تحفظ اور ملازمت کی گارنٹی موجود نہیں ہے اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو نوجوان خود کو وقف کرتا ہے، اس کے بارے میں عام طور پر یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ کرے گا کیا؟ اور مولوی تو بن جائے گا لیکن کھائے گا کہاں سے؟ اس کے جواب میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ ایسا کہنے والوں سے میرا سوال ہے کہ کیا آج تک کسی مولوی یا حافظ کو انہوں نے بھوکا مرتے دیکھا ہے؟ کسی مولوی، حافظ یا قاری کو بھوک اور فاقے کی وجہ سے خودکشی کرتے دیکھا ہے؟ یا پاکستان کی پوری تاریخ میں مولویوں، قاریوں، یا حافظوں کا کوئی جلوس سڑک پر آیا ہے کہ ان کا گزارا نہیں ہوتا، ان کی تنخواہیں بڑھائی جائیں اور انہیں سہولتیں فراہم کی جائیں؟ کبھی مولوی یا قاریوں نے ہڑتال کی ہو کہ وہ تنخواہیں نہ بڑھانے کی وجہ سے نماز پڑھانے سے انکار کر رہے ہیں یا نماز پڑھانے کے لیے تیار نہیں ہیں؟ اکا دکا شخصی واقعات سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن مجموعی طور پر طبقاتی حیثیت سے دینی حلقوں میں کبھی اس حوالے سے ہڑتال، جلوس، قرارداد یا مطالبات کی فضا دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔ میرے ان سوالات کا مطلب یہ ہے کہ جب مولوی خود اپنے افلاس، فقر اور محتاجی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹ رہا تو کسی دوسرے کو اس کے لیے

ایک مسلم ملک میں مسلمان حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا، متوازی نظام قائم کرنے کی کوشش کرنا اور عام لوگوں کو از خود سزا دینے کا طریقہ اختیار کرنا کسی طرح بھی جائز عمل نہیں کہلا سکتا۔

پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسری گزارش ہے کہ اس صورت حال کی وجہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دین کی برکت سے مولوی بلکہ دین اور مسجد سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو ضروریات کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے اور یہ عملی تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص بحمداللہ تعالیٰ بھوکا نہیں مرتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مولوی اور حافظ کو صرف تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ اس بات کی ذہنی تربیت بھی دی جاتی ہے کہ نماز پڑھانا اور قرآن کریم کی تعلیم دینا اس کا پیشہ نہیں بلکہ مشن اور دینی خدمت ہے، اس لیے وہ قناعت کرتا ہے، ضروریات کو ضروریات تک محدود رکھتا ہے اور اتنے تھوڑے وظیفہ پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے بلکہ عملاً کر کے دکھا دیتا ہے جتنے وظیفہ میں کسی دوسرے شعبہ کا کوئی فرد اتنا کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر آپ نے مشاہدہ کرنا ہو تو اپنے قریبی کسی مسجد کے امام یا کسی مدرسہ کے مدرس سے اس کی تنخواہ اور سہولتوں کے بارے میں پوچھ لیں اور اس کی ڈیوٹی کی نوعیت اور اوقات کار کے بارے میں بھی دریافت کر لیں، آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اور آپ کو صحیح طور پر اندازہ ہوگا کہ غریب مولوی طعنہ، تحقیر اور تذلیل کے ہر وار کو برداشت کرتے ہوئے کتنے معمولی وسائل کے ساتھ معاشرہ کی

کتنی بڑی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔

س: لال مسجد اسلام آباد کی انتظامیہ نے حال ہی میں قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر احتساب کا نظام خود قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کا اِس بارے میں کیا خیال ہے؟

ج: کچھ دنوں لال مسجد اسلام آباد کی انتظامیہ کے رضا کاروں نے مبینہ طور پر قحبہ خانے پر چھاپہ مار کر وہاں کی انچارج خاتون کو حراست میں لے لیا اور ابھی چند روز بعد ایک مساج پارلر کے کارندوں کو حراست میں لینے کے بعد اسلام آباد انتظامیہ کی اس یقین دہانی پر انھیں آزاد کیا کہ اسلام آباد میں مساج پارلروں کو بند کر دیا جائے گا۔ اس پر ملک بھر میں یہ سوال کھڑا ہو گیا کہ کیا اس طرح پرائیویٹ طور پر احتساب کا نظام قائم کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لے کر برائی کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرنا درست عمل ہے؟ ملک بھر کے سنجیدہ حلقوں نے اس طرزِ عمل سے اختلاف کیا اور ہم نے بھی واضح طور پر عرض کیا کہ حکومت وقت کے ساتھ تصادم کا ماحول پیدا کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لینا شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً کسی بھی لحاظ سے درست طرزِ عمل نہیں ہے اور لال مسجد کی انتظامیہ کو زود یا بدیر اس طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی، لیکن ہمارے خیال میں ابھی تک یہ بحث یک طرفہ طور پر چل رہی ہے اور معاملہ کے صرف ایک رُخ پر مسلسل بات کی جا رہی ہے کہ برائیوں کی روک تھام کے لیے پرائیویٹ سطح پر کوئی کارروائی کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لینا درست نہیں ہے، جبکہ اس معاملے کے دوسرے رُخ پر توجہ دینے سے ہمارے دانش ور ابھی تک کترا رہے ہیں کہ معاشرہ میں منکرات کی روک تھام آخر کس کی ذمہ داری ہے؟ خصوصاً جب صورت حال یہ ہو گئی ہو کہ حکومتی ادارے فحاشی اور منکرات کی روک تھام کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کے بجائے خود ان کے فروغ کا ذریعہ بن رہے ہوں،

سیاسی اور دینی جماعتوں نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہو اور سماجی اداروں کے ایجنڈے میں بھی یہ بات شامل نہ ہو تو کیا عملاً یہی صورت نہیں بن جاتی کہ سوسائٹی نے برائی کو اجتماعی طور پر قبول کر لیا ہے اور اس کا کوئی طبقہ برائی کی روک تھام کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کو تیار نہیں ہے؟ ہمارا یہ سوال ان طبقات اور ارباب دانش سے ہے جو قرآن وسنت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے موجود تعلیمات سے آگاہ ہیں کہ کیا منکرات وفواحش کے مسلسل فروغ پر سوسائٹی کی اجتماعی خاموشی کی صورت حال کو قبول کر لیا جائے اور ایسی صورت میں قرآن وسنت میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں، انھیں یکسر نظر انداز کر دیا جائے؟ اور کیا ارشاد ربانی 'کالذین نسو االله فانساهم انفسهم' کا عملی منظر اسی طرح کا نہیں ہوتا؟

مساج پارلروں کا معاملہ ہی ساتھ رکھ لیا جائے جن میں نوجوان اور نوعمر لڑکیاں مردوں کو مساج کرتی ہیں اور مساج کے نام پر بدکاری کا ایک وسیع نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں اس قسم کے بدکاری کے اڈوں کی موجودگی، ان کا فروغ اور ان پر حکومتی اداروں، دینی وسیاسی جماعتوں کی خاموشی اور سماجی اداروں کی لاتعلقی اور بے حسی کا ایک انتہائی افسوس ناک منظر سامنے ہے۔ اس صورت حال میں اگر ہمارے دانش ور صرف لال مسجد کی انتظامیہ کو ہی کوستے چلے جائیں کہ وہ غلط کر رہے ہیں، انھیں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے اور از خود کسی کارروائی سے گریز کرنا چاہیے تو ہمارے نزدیک یہ بات صحیح ہونے کے باوجود ادھوری اور یک طرفہ ہے۔

لال مسجد کی انتظامیہ کے طریقہ کار کو ہم بھی غلط سمجھتے ہیں جس کا ہم نے برملا اظہار کیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ ردعمل ہے منکرات وفواحش کے مسلسل فروغ پر حکومتی اداروں، دینی وسیاسی جماعتوں اور سماجی اداروں کی

مجرمانہ خاموشی اور بے حسی کا جو منکرات وفواحش ہی کی طرح پیہم بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہم ارباب فکر و دانش سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ وہ لال مسجد کی انتظامیہ کو اس کے غلط طریق کار پر ضرور ٹوکیں اور انھیں سمجھائیں کہ برائی کو روکنے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمارے دانش وروں کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ قوم کو بتائیں کہ مسلم معاشرے کو منکرات وفواحش سے پاک رکھنا کس طرح ممکن ہے اور برائیوں کی روک تھام کے لیے حکومتی اداروں، دینی وسیاسی جماعتوں اور سماجی اداروں کی ذمہ داری کیا ہے؟

س: لال مسجد اسلام آباد کا بحران جن مضمرات اور نتائج کی نشاندہی کر رہا ہے، آپ کے تاثرات اس بارے میں کیا ہیں؟

ج: مولانا عبدالعزیز کی گرفتاری کے بعد لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا حکومت کے ساتھ تنازع ایک لحاظ سے اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے اور ان کے نائب مولانا عبدالرشید غازی کی طرف سے خود کو حکومت کے حوالے کرنے کی مشروط پیش کش نے حکومت کے ساتھ ان کی مسلح مزاحمت کے باقی ماندہ امکانات کو بھی ختم کر دیا ہے۔ جب ان دونوں بھائیوں نے چند ماہ قبل اپنے بعض مطالبات کے لیے محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا تھا، اس وقت ملک کے سنجیدہ دینی حلقوں اور ان کے خیر خواہوں کی طرف سے انھیں یہ کہہ دیا گیا تھا کہ حکومت کے ساتھ اس طرح کی محاذ آرائی کا طریقہ درست اور قابل عمل نہیں ہے، اس لیے وہ اسے ترک کر دیں اور ملک کی علمی و دینی قیادت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی مشاورت کے ساتھ اپنے مطالبات منوانے کے لیے جدوجہد کا طریقۂ کار از سر نو طے کریں، لیکن انھوں نے کوئی بھی معقول بات ماننے کے بجائے خود اپنے طے کردہ طریق کار پر قائم رہنے کا اعلان کر دیا اور اس پر ڈٹے رہے جس کا منطقی نتیجہ یہی ہونا تھا جو سامنے آ چکا ہے کہ دو درجن کے لگ بھگ شہریوں کی ہلاکت اور

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے معاملات طے ہونے کے قریب پہنچ گئے تھے کہ کسی خفیہ ہاتھ نے معاملات کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ بعض عناصر یہ منظر بہرصورت دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک طرف ملک کی مسلح فورسز ہیں اور دوسری طرف ان کے مقابلے میں ایک دینی مدرسے کے طلبہ وطالبات ہتھیار اٹھائے مزاحمت کے لیے مورچہ زن ہیں۔

ملٹری فورسز کے آپریشن کے بعد غازی برادران کی پسپائی کا تماشا پوری دنیا دیکھ رہی ہے۔

جہاں تک ان مطالبات کا تعلق ہے کہ اسلام آباد میں سرکاری طور پر گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کیا جائے، ملک میں اسلامی نظام کا مکمل نفاذ عمل میں لایا جائے، فحاشی اور بدکاری کے مبینہ اڈے ختم کیے جائیں اور حدود آرڈیننس میں کی گئی حالیہ غیر شرعی ترامیم واپس لی جائیں تو ان میں سے کوئی مطالبہ بھی ایسا نہیں ہے جسے ناجائز کہا جا سکے بلکہ یہ خود دستور پاکستان کے اسلامی ونظریاتی تقاضوں کو پورا کرنے کے مطالبات ہیں، لیکن اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا، اس سے ملک کے ہر ذی شعور شخص نے اختلاف کیا اور اسے غلط ٹھہرایا، اس لیے کہ ایک مسلم ملک میں مسلمان حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا، متوازی نظام قائم کرنے کی کوشش کرنا اور عام لوگوں کو از خود سزا دینے کا طریقہ اختیار کرنا کسی طرح بھی جائز عمل نہیں کہلا سکتا، لیکن نہ صرف یہ کہ اس پر اصرار کیا گیا بلکہ اسے ''جہاد'' قرار دیا گیا اور طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد کو اس مقصد کے لیے ڈھال بنایا گیا جس سے معاملہ بتدریج سنگین سے سنگین تر صورت اختیار کرتا چلا گیا۔

دوسری طرف حکومت نے لال مسجد کی انتظامیہ کے غلط طریقِ کار کی آڑ میں ان جائز مطالبات کو مسلسل نظرانداز کیا جن کی ملک کے دینی حلقے حمایت کر رہے ہیں اور اس مسئلے کو مذاکرات کے ذریعے سے حل کرنے کے بجائے اسے زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش کی جس سے ملک کے سنجیدہ حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ یہ سارا معاملہ خود حکومت کا پیدا کردہ ہے اور حکومت اس سے نہ صرف ملک کے اندر سیاسی فوائد حاصل کر رہی ہے بلکہ اسے دنیا میں دینی مدارس کے بارے میں غلط تاثرات پھیلانے کا ذریعہ بھی بنایا جا رہا ہے۔

دینی مدارس کے بارے میں سالہا سال سے عالمی میڈیا اور ادارے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ان میں اسلحہ کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور یہ مبینہ طور پر دہشت گردی کے مراکز ہیں لیکن دینی مدارس کے وفاقوں کی قیادت نے مسلسل محنت کے ساتھ اس تاثر کو زائل کیا اور عالمی رائے عامہ کو کسی حد تک یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی کہ جنوبی ایشیا کے یہ دینی مدارس صرف تعلیم اور نظریاتی وفکری تربیت تک محدود ہیں، ان میں نہ اسلحہ کی تربیت دی جاتی ہے اور نہ ہی ان میں اسلحہ موجود ہے۔ اس پر پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے بھی، جب وہ وزیر داخلہ تھے، مضبوط اسٹینڈ لیا اور واضح طور پر دنیا کو بتایا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں اسلحہ کی موجودگی اور اس کی ٹریننگ کے الزامات بے بنیاد اور خلاف واقعہ ہیں۔ حقیقت حال اب بھی یہی ہے اور جامعہ حفصہ کی طرز کے اکا دکا مدارس کے علاوہ ملک بھر کے ہزاروں دینی مدارس میں کوئی ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں اسلحہ کی ٹریننگ یا اسلحہ کے استعمال کی ترغیب دی جاتی ہو لیکن جامعہ حفصہ کی صورت حال نے اس تاثر کو الٹ دیا اور لوگوں کو پاکستان کے وفاقی دارالحکومت کے ایک بڑے مدرسے میں نہ صرف طلبہ بلکہ طالبات کے ہاتھوں میں بھی اسلحہ دکھائی دینے لگا ہے۔

ہمارے نزدیک حکومت نے معاملے کو حد سے زیادہ طول دے کر دیگر سیاسی مقاصد کے ساتھ ساتھ اس

غازی برادران نے ایک غلط طریق کار پر بے جا اصرار کر کے ..... ملک بھر کے دینی حلقوں کا اعتماد کھویا اور محاذ آرائی کو تصادم تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔

تاثر کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ اس پر چودھری شجاعت حسین کے ایک حالیہ بیان کو بطور شہادت پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کی کوششوں سے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے سے معاملات طے ہونے کے قریب پہنچ گئے تھے کہ کسی خفیہ ہاتھ نے معاملات کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بعض عناصر یہ منظر بہرصورت دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک طرف ملک کی مسلح فورسز ہیں اور دوسری طرف ان کے مقابلے میں ایک دینی مدرسے کے طلبہ اور طالبات ہتھیار اٹھائے مزاحمت کے لیے مورچہ زن ہیں اور ایسا چاہنے والے عناصر اس مقصد میں بہرحال کامیاب ہو گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس افسوس ناک صورت حال کی ذمہ داری دونوں فریقوں پر عائد ہوتی ہے۔ غازی برادران نے ایک غلط طریق کار پر بے جا اصرار کر کے جہاں ملک بھر کے دینی حلقوں کا اعتماد کھویا اور محاذ آرائی کو تصادم تک پہنچانے کا ذریعہ بنے تو دوسری طرف حکومت نے معاملات کو حد سے زیادہ طول دے کر اور مذاکرات کے لیے کوئی سنجیدہ صورت اختیار کرنے سے عمداً گریز کر کے معاملات کو یہاں تک پہنچا دیا۔

"محترمی ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب جدیدیت اور اصلاح کی تحریکوں سے ذاتی اور علمی طور پر وابستہ رہے ہیں۔ اسلامی نظامِ تعلیم اور جدیدیت کے موضوع پر ایک طویل عرصے سے ایک تحقیقی منصوبے میں مصروف ہیں۔ ان کی یہ کتاب ان مسائل کا بصیرت افروز اور غیر جانبدارانہ مطالعہ پیش کرتی ہے۔ یہ مختلف مکاتیبِ فکر کے مدارس سے تعلق رکھنے والے علماء سے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب علماء کے نقطۂ نظر کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دے گی اور اُن غلط فہمیوں کا ازالہ کرے گی جو مدارس اور دینی نظامِ تعلیم کے بارے میں پائی جاتی ہیں۔"

ڈاکٹر محمد خالد مسعود

ڈائریکٹر جنرل، ادارۂ تحقیقات اسلامی

سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل

دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد مغربی طاقتوں نے ایک منصوبے کے تحت سویت یونین کو اپنا اگلا حدف بنالیا۔ یہ منصوبہ آخر کامیاب ہوا۔ سویت یونین کے مختلف حصے اب الگ الگ آزاد ریاستیں ہیں۔ کمیونسٹ روس کی شکست وریخت کے فوراً بعد جب نیٹو کے سیکرٹری جنرل سے پوچھا گیا کہ اب نیٹو کے وجود اور اس کے مزید مضبوط بنانے کا کیا جواز ہے؟ تو انہوں نے برملا جواب دیا کہ اب "سرخ خطرے" سے بھی زیادہ خطرناک Green Menace یعنی اسلامی دنیا اور اس کے اندر موجود مزاحمتی تحریکوں کا سامنا ہوگا۔ اور ان تحریکوں کو قوت فراہم کرنے میں دینی مدارس بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔

باوجود معلومات کی کمی اور تعصب کی فراوانی کے آج ٹارگٹ دینی مدارس ہیں اور ان اداروں کے بارے میں مغربی دنیا کے اذہان کو بے بنیاد "معلومات" شب وروز یکطرفہ طور پر جنگی بنیادوں پر فراہم کی جارہی ہیں، جس سے سیاسی تنظیموں اور حکومتی اداروں میں جنون کی حد تک فضا مسموم ہو چکی ہے کہ اصل حقائق کے بارے میں ذرائع ابلاغ اس تاثر کے برعکس کچھ سننے کو ہی تیار نہیں ہیں۔

محترم ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب نے ایک انتہائی موثر انداز میں حقائق پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش فرمائی ہے۔ جس سے اُردو زبان سے واقف ایک بڑی تعداد مستفید ہوگی۔ لیکن اس کاوش کے فیض سے بہرہ مند کرنے کے لیے اس کا ترجمہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں کرانا لازمی ہے تاکہ تعصب کی تہیں اُن اذہان سے صاف ہو سکیں جہاں ان پر دن رات کام ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب کو اس موثر کوشش پر اجر عظیم عطا فرمائیں۔

راجہ محمد ظفر الحق

سیکرٹری جنرل موتمر العالم الاسلامی

اس کتاب کے مؤلف ڈاکٹر ممتاز احمد ۲۰۱۰ء سے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد سے بطور صدر (وائس چانسلر) وابستہ ہیں۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے (سیاسیات)، امریکن یونیورسٹی آف بیروت سے ایم۔اے (Development) اور یونیورسٹی آف شکاگو سے پی۔ایچ ڈی (سیاسیات) کی ڈگریاں حاصل کیں اور امریکہ میں چونتیس سال تک جنوبی ایشیاء اور مشرق وسطیٰ کی سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے امور پر تعلیمی اور تحقیقی اداروں سے وابستہ رہے۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد جوائن کرنے سے پہلے آپ نے بیس سال تک ہیمپٹن یونیورسٹی (ورجینیا) میں سیاسیات کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد نے سینئر فل برائٹ (Fulbright) فیلو اور USIP فیلو کی حیثیت سے بنگلہ دیش، اردن، فلسطین، پاکستان، ملائیشیا اور سوڈان میں سیاست، ریاست اور مذہب، مدارس کے نظام تعلیم اور اسلامی تحریکات پر مطالعہ اور تحقیق کا کام کیا۔ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کی سیاست کے علاوہ ڈاکٹر ممتاز احمد نے جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے زیر اہتمام Muslims in American Public Square پراجیکٹ میں حصہ لیا اور اسی موضوع پر ایک کتاب بھی مرتب کی۔ تین سال قبل انہوں نے The State of Islamic Studies in American Universities کے موضوع پر ایک اہم تحقیقی منصوبے کی قیادت کی۔ اس تحقیق کے سلسلے کی پہلی جلد Observing the Observer کے نام سے ۲۰۱۲ء میں لندن اور واشنگٹن سے بیک وقت شائع ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد کی دس تصنیفات امریکہ اور پاکستان سے شائع ہو چکی ہیں۔ بنگلہ دیش اور پاکستان میں دینی مدارس کے نظام تعلیم پر اُن کے تین مونوگراف اور جاوید احمد غامدی، ڈاکٹر فرحت ہاشمی، ڈاکٹر طاہر القادری اور ڈاکٹر اسرار احمد پر اُن کا ایک تفصیلی مطالعہ National Bureau of Asian Research کی طرف سے اور جماعتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت پر ایک جامع مطالعہ University of Chicago Press سے شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ادارے اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر اور کالج آف ولیم اینڈ میری (Williamsburg, Virginia) میں Distinguished Visiting Scholar بھی ہیں۔

ISBN: 978-969-9556-04-3

Price Rs: 590 US$ 12